مولانا عبیداللہ سندھی

افکار و خدمات

ڈاکٹر ابوسلمان سندھی

مولانا عبیداللہ سندھی

افکار و خدمات

مضامین

مولانا دین محمد وفائی

مرتب

ڈاکٹر ابو سلمان سندھی
شاہد حسین خاں

المحمود اکیڈمی

عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

ضابطہ کا صفحہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

کتاب : مولانا عبید اللہ سندھی ۔۔۔ افکار و خدمات

مرتب : ڈاکٹر ابو سلمان سندھی و شاہد حسین خان

ناشر: المحمود اکیڈمی ۔ اردو بازار ۔ لاہور

مطبع : ایچ وائی پرنٹرز ۔ لاہور

اشاعت : مئی 1995

تعداد : 500

قیمت : 70 روپے

بہ اہتمام

مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی ۔ پاکستان

بیاد

امام انقلاب

مولانا عبید اللہ سندھی

(۱۸۷۲ء - ۱۹۴۴ء)

بموقعہ

پچاس سالہ یوم وفات

۲۲ - اگست ۱۹۹۴ء

مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی
پاکستان

فہرست

مولانا عبید اللہ سندھی

خدا شناس ، خود آگاہ ، بندہ مومن
ترے وجود سے تصدیق زندگانی تھی
ترے احاطہ دل میں تھا موجزن بیشک
وہ بحر حس کے مقدر میں بے کرانی تھی

لطیف انور

حرفے چند

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے پچاس سالہ یوم وفات کے پروگرام کے سلسلے میں حضرت مرحوم کے متعلق مواد کی تلاش ہوئی تو سب سے پہلے میں نے اپنے ہی ذخیرے کا جائزہ لیا۔ اتفاق سے ایک فائل میں مولانا دین محمد وفائی کے کچھ مضامین مل گئے کچھ اور مضامین کی فکر ہوئی تو مولانا عزیز اللہ جروار صاحب اور عزیزم ثناء اللہ سومرو سلمہ کی عنایت سے دستیاب ہو گئے اور اس یقین کے ساتھ کہ اب مولانا وفائی مرحوم کا شاید ہی کوئی مضمون حضرت امام سندھی کے متعلق اس مجموعے میں جگہ پانے سے رہ گیا ہو۔ بعض عزیزوں اور مخلصوں سے ترجمہ کی درخواست کی۔ خوشی ہوئی کہ یہ درخواست بھی شرف قبولیت سے محروم نہ رہی۔ ان عزیزوں اور مخلصوں کا شکرگذار ہوں۔

یہ مضامین مرتب ہو کر سامنے آئے تو اندازہ ہوا کہ ضخیم نہ سہی مختصر ہی ایک ایسی کتاب تیار ہو گئی جو حضرت مولانا دین محمد وفائی کے اسم سامی کی نسبت سے شرف پائے گی۔

مولانا دین محمد وفائی حضرت سندھی کے بڑے معتقد اور ان کے افکار کے بہت شیدائی تھے۔ کچھ مدت تک انہوں نے قرآن حکیم کے علوم و افکار میں مولانا سندھی سے استفادہ کیا تھا اور محض رسمی طور پر نہیں بلکہ باقاعدہ زانوے تلمذتہ کیا تھا۔ روزنامہ الوحید کراچی کی ادارت جو ایک معقول ذریعہ آمدنی کے علاوہ ایک باعزت ملازمت تھی۔ دراصل مولانا سندھی کے عشق کی نذر ہوئی تھی۔ مولانا وفائی قوم پرور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا سندھی کی صحبت نے انہیں ان عقائد میں اور بھی پختہ کر دیا تھا الوحید کی پالیسی اس کے ڈائریکٹرز کے ذوق و مصالح نے ان جذبات پر رکھی تھی، جنہوں نے مسلمانوں سے ان کی تمیز اخلاق و تہذیب کو متاثر کر دیا تھا۔ مولانا وفائی کی بصیرت نے ان پر جس حقیقت کو واشگاف کر دیا تھا، ممکن نہ تھا کہ وہ اس سے انکار کر

دیتے اور صرف ملازمت و عزت کی خاطر حالات سے مصالحت کر لیتے۔ انہوں نے سوچا کہ جب عشق میں عزت سادات گنوانا ہی ٹھہرا تو آج اور کل کی کشمکش کیوں۔

بہ قول میر

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور دامن جھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت مولانا سندھی دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا میں تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علائق دنیا کی ٹوٹی ہوئی زنجیروں کے ٹکڑے حضرت مرحوم کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔ اس کے بعد سوائے اس کے کہ اہل حدیث مسلک کے مطابق دین کے تمام عقائد و عبادات میں تمسک بالکتاب والسنتہ کے تقاضے پورے کرتے رہے۔ سیاسی افکار و عقائد میں انہوں نے حضرت سندھی کا جو مسلک علم و حق قبول کر لیا تھا، اس سے زندگی بھر سرمو تجاوز نہ کیا۔ نہ محض تقلیداً بلکہ ان کے علم و نظر نے اس مسلک کی سچائی کو ان کے قلب پر واضح کر دیا تھا۔ مولانا سندھی مرحوم کی صحبت کا اثر اور نظر کا فیضان تھا کہ وہ حضرت امام ولی اللہ دہلوی کے علوم و معارف کے بہت والہ و شیدا ہو گئے تھے۔

ان مضامین کی تالیف میں ایک تصنیف کی شان تو پیدا نہیں ہو سکتی تھی، لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جو معلومات و افکار ان مضامین میں آپ کے مطالعے میں آئیں گے۔ وہ بعد کے کسی مصنف کی تحریروں میں نہیں مل سکتے۔ حضرت امام سندھی کی زندگی اور افکار کا یہ بنیادی مواد ہے، جو ان مضامین میں فراہم کر دیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت مسلم ہے۔ آئندہ حضرت امام سندھی پر تحقیق اور تالیف و تحریر و تصنیف کا جو دور شروع ہو گا، اس میں یہ مضامین عام طور پر بنیادی مآخذ قرار پائیں گے۔

امید ہے کہ اصحاب ذوق میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

ابو سلمان سندھی

تاثرات

آخر میں کیا لکھوں؟

توحید کے "عبید اللہ نمبر" کی اشاعت کے عزم سے بعض احباب کو مطلع کرنے کے بعد میں خود اس ششش و پنج میں پڑ گیا کہ اس عظیم المرتبت ہستی، علوم کے اس بحر ناپیدا کنار، شریعت و طریقت کے جامع اور تجلی الہیٰ کے عارف بزرگ کے بارے میں کیا لکھوں؟ اور اس کا تعارف کرایا جائے تو کس زبان میں اور اس کے لیے کیا اسلوب اختیار کیا جائے؟ خواجہ حالی نے مرزا غالب کے مرثیے میں لکھا تھا:

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل ، پاک ذات، پاک صفات

غالب کے بارے میں تو معلوم نہیں کہ حقیقت کیا تھی۔ وہ واقعی ان صفات کا حامل تھا یا یہ محض مبالغہ ہے۔ لیکن اگر غموں سے نڈھال ہمارے دل اور زخموں سے چور ہمارے جگر سے کوئی پوچھے کہ ہم نے کیا دیکھا تھا، کیا سنا تھا، کیا پایا تھا اور اب ہم کیا کھو بیٹھے ہیں تو ہم اسے کیا کیا بتائیں!

کیا کہوں حال دردِ پنہانی
وقت کوتاہ و قصہ طولانی

تشنگان علوم اپنی پیاس بجھانے کے لیے چشمہ شیریں تک پہنچے تھے کہ اچانک وہ چشمہ ہی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بتاؤ! خدارا مجھے بتاؤ! اگر ایک مضطرب تشنہ لب کے سامنے سے آب حیات کا پیالہ ٹھیک اس وقت اچک لیا جائے جب وہ مضطربانہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہو، تو اس کی حالت کیا ہو گی؟

جب پروفیسر محمد سرور صاحب بی اے کی کتاب " مولانا عبید اللہ سندھی ۔۔۔ حالات و تعلیمات " جس میں مولانا مرحوم کے مختصر سوانح اور ان کے افکار و افادات کا تعارف کرایا گیا تھا، شائع ہوئی تو ایک طالب علم نے مولانا سے دریافت کیا کہ آیا ابھی اور کچھ

باتیں ہیں جو سرور صاحب کی کتاب میں آنے سے رہ گئی ہوں؟ مولانا سندھی نے فرمایا:

"جو کچھ بتانا چاہتا ہوں یہ تو اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں۔"

کون اندازہ کر سکتا ہے کہ علوم و معارف کا کتنا بڑا خزانہ تھا جو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہوگیا اور ان شائقین علم کی کیا حالت ہوگی جو اس بے مثل و بیش بہا خزانے سے علم کے موتی چننے اور معارف کے جواہر حاصل کرنے سے محروم رہ گئے ہیں۔

حضرت مولانا امام عبید اللہ سندھی کی وفات صرف ان کے حلقۂ معتقدین ہی کے لیے ایک الم ناک حادثہ نہیں بلکہ پوری قوم اور ملت اسلامیہ کے لیے بہت بڑا قومی، سیاسی اور مذہبی حادثہ ہے۔ امام عبید اللہ کے حادثۂ انتقال سے قوم و ملت کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی۔ اس قسم اور اس پائے کے وجود ہائے گراں مایہ ہزاروں سال کی سیر و گردش کے بعد منصۂ شہود پر جلوہ فگن ہوتے ہیں۔

اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
چمن میں جب کہیں ہوتا ہے جا کر دیدہ ور پیدا

اور جب وہ دنیا سے اٹھ جاتے ہیں تو قرنوں تک کے لیے دنیائے علم و دانش میں تاریکی پھیل جاتی ہے۔

وہ قوم کی نجات اور ملت کی فلاح کے لیے سعی و عمل کی جس راہ میں فوت ہوئے ہیں۔ اس راہ میں مرنے والے کبھی نہیں مرتے۔ ان کی موت شہادت کی موت ہوتی ہے اور شہادت کی موت موت نہیں زندگی ہوتی ہے۔ لیکن اس زندگی کی حقیقت کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے مقام کی عظمت اور ان کی عظیم الشان قومی اور ملی خدمات کی اہمیت کا ہر کوئی اندازہ شناس نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہے اور واقعی یہی بات ہے تو یہ ہماری نظر و بصیرت کا قصور ہے۔ وہ شخص تو مولانا روم کی زبان میں ہمیشہ یہی کہتا رہا:

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو
از شما کس نے شدہ اسرار جو

آہ ! ایسے مردان حراور حق آگاہ انسان اقوام و ملل میں کیا آسانی سے اور روز روز پیدا ہوتے ہیں؟ کان لگائیے اور سنیے کہ سنائی غزنوی کیا کہتا ہے اور کس راز سے پردہ ہٹا رہا ہے :

سالہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بوسعیدؒ اندر خراساں ! اویسؓ اندر قرن

ہائے یہ کیا ہوگیا، کیا حادثہ پیش آیا اور بزم علم و دانش سے یہ کون اٹھ گیا کہ جس کے اٹھتے ہی ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیل گئی ۔ بہ قول غالب :

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع تھی دلیل سحر، سو خموش ہے

(توحید، کراچی ۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

مولانا سندھی کا انتقال

حضرت امام علامہ استاد مولانا عبید اللہ سندھی ۲۔ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۲۔ اگست ۱۹۴۴ء کو گوٹھ دین پور متصل خان پور (ریاست بہاول پور) میں انتقال فرما گئے۔ انتقال کے وقت مولانا مرحوم کی عمر تقریباً اکہتر برس کی تھی۔ حضرت مولانا سندھی کی صاحبزادی دین پور کے بزرگ حضرت سراج الاسلام مولانا غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حبالہ عقد میں ہیں۔ یہ خاتون بفضلہ تعالیٰ حیات ہیں اور مولوی میاں ظہیر الحق ان کے صاحبزادے حضرت مولانا مرحوم سندھی کے نواسے ان کے نسبی وارث ہیں۔ میاں صاحب حضرت مولانا مرحوم کے معتقدین اور مخلصین کی تعزیت کے مستحق ہیں۔

مفصل حالات کے لیے آئندہ شمارہ "توحید" کا انتظار کیجیے۔

(توحید۔ کراچی ستمبر ۱۹۴۴ء)

حضرت امام سندھی کی یادیں

مجسم عمل، عمیق جذبہ شوق، کائنات کے ذرے ذرے سے محبت، جوہر انسانیت کو بیدار کرنے کے لیے پیہم اضطراب، تصوف اور مذہب کو یکجا کرنے کے لیے قرآن و حدیث کے اسرار تک رسائی اور ملک و قوم کی راہ کے شہید۔ اگر کسی کو ان تمام اوصاف و کمالات کا نظارہ کسی ایک شخصیت میں کرنا ہو تو اسے صرف مولانا عبید اللہ سندھی کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ہم نے مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنے سر کی آنکھوں سے ایک عام مولوی کے روپ میں نہیں دیکھا بلکہ علم کی روشنی میں بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بہت بڑے عالم، عظیم مفسر، محقق محدث، بے نظیر مجتہد، نامور فقیہہ، بلند پایہ فلسفی، اور مقرب بارگاہ الہیٰ تھے۔ افسوس کہ لوگوں نے ان کی شخصیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کرنے کے باوجود کسی نے ان کے باطن میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ اگر وہ ان کے باطن کا مطالعہ کر لیتے تو اس کی رنگینیوں اور دلاویزیوں کے سامنے دوسرے پہلوؤں کے تمام رنگ پھیکے نظر آنے لگتے۔ حضرت سندھی کا وجود گرامی ایک سربستہ راز تھا اور اس سے پہلے کہ یہ راز کسی شخص پر بھی ظاہر ہوتا وہ خود ہماری نظروں سے غائب ہو گئے اور اب ہم میں اور ان میں موت کی وہ دیوار کھڑی ہو گئی ہے، جسے عبور کیے بغیر ہم ان کی ذات و صفات کی جلوہ آرائیوں سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک اور قلب کو سکون نہیں بخش سکتے اور نہ ہم ان کے اس مقام بلند کا کوئی اندازہ کر سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ علیین میں عطا فرمایا ہو گا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی وفات حسرت آیات پر ہندوستان کے اخبارات میں بہت ماتم برپا ہوا ہے، غم ناک تحریروں سے کالم سیاہ کیے گئے ہیں، اصحاب علم و عمل نے اپنے اپنے انداز میں تاثرات بیان کیے ہیں اور رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور اس طرح

اظہار رنج و غم کی وہ تمام رسمیں ادا کی جا چکی ہیں جو کسی عظیم شخصیت کی وفات پر عام طور پر کی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کیا گیا جو کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ کسی شخص نے ان کی زندگی کے ان پہلوؤں کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا اور ان کے باطن میں کسی نے جھانک کر دیکھا نہ تھا۔ کوئی ان کے باطن میں چھپی ہوئی ان حقیقتوں کا ادراک ہی نہ کر سکا تھا، ان کے بارے میں وہ لکھا گیا! اس لیے میرا یقین ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کے بارے میں ابھی تک کچھ بھی نہ لکھا جا سکا، جسے میری آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں اور دل جن حقائق کا متلاشی ہے۔

حضرت مولانا سندھی ہم سے جدا ہو گئے اور سرگشتگان راہ ان کی رہنمائی سے اور تشنگان فیض اس سرچشمۂ شیریں کی سیرابی سے محروم رہ گئے۔ اس علوم کے بحر بیکراں اور معارف کے سرچشمہ سے کسی کی پیاس تو کیا بجھتی کسی کے لب بھی تر نہ ہوئے تھے کہ وہ چشمہ فیض ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پلک جھپکتے میں علم و عرفان کی وہ محفل ہی درہم برہم ہو گئی۔

آج ان کی مقدس صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں اور ان کی ایمان افروز صحبتوں کی یادیں آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ حضرت مولانا آج ہم میں نہیں رہے، مگر ان کا پیغام اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے خصوصاً سندھ کی ترقی کا عظیم الشان منصوبہ ہمارے پاس ان کی یادگار ہے۔ اگر ہم نے صبر و استقلال سے ان کے پروگرام پر عمل کیا تو نہ صرف ہم اپنے ملک کو ترقی یافتہ قوموں کی صف میں جگہ دلائیں گے۔ بلکہ ہم خود بھی حیات جاوید کے مالک ہوں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

(توحید۔ ستمبر ۱۹۴۴ء)

ترجمہ: پروفیسر انور احمد۔ گورنمنٹ ڈگری سائنس اینڈ کامرس کالج اورنگی ٹاؤن۔ کراچی

شخصیت و خدمات

مولانا سندھی سے میرا تعلق

مولانا دین محمد وفائی نے اکتوبر ۱۹۴۵ء کے توحید میں "میرا مسلک" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں مولانا سندھی مرحوم سے اپنے تعلق کا بھی اظہار کیا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

یہ (۱۹۳۹ء کے بعد کا) وہ زمانہ تھا کہ مولانا عبید اللہ سندھی (وطن) تشریف لا چکے تھے۔ ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ان کی صحبتوں میں سیاسی اور مذہبی خیالات کو جلا ملی اور بہت سی باتیں جن کی وجہ سے مایوسی پیدا ہوئی تھی اور دل پژمردہ ہو گیا تھا، حضرت مولانا سندھی کے فیض صحبت سے دل پھر ولولوں سے معمور ہو گیا اور میں ایک امنگ کے ساتھ اپنا سیاسی اور سماجی کردار ادا کرنے کے لیے مستعد ہو گیا۔

اسی مضمون میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

"میں جب الوحید کی ادارتی ذمہ داری سے سبک دوش ہوا تو مولانا عبید اللہ سندھی کراچی میں مقیم تھے۔ موصوف نے میرے ساتھ مہربانی فرمائی اور مجھے لیگ اور کانگریس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر سمجھایا۔ میں دو مہینے ان کی رفاقت میں رہا۔ مجھے مولانا سے بے غرض محبت تھی وہ مجھے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ اپنی فکر اور لیگ کے بارے میں اپنے خیالات سے آشنا کرتے رہے۔

میں نے دیکھا کہ مولانا نے لیگ کی لیڈر شپ کا جو تجزیہ کیا تھا اور اس کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، حرف بہ حرف اسی طرح ہوا۔ لیگ کے رہنما رفتہ رفتہ ان مقاصد سے دور ہوتے گئے، جن کا اعلان و اظہار انہوں نے کیا تھا۔

الوحید کے استعفٰے کے بعد دو سال کا عرصہ بے روزگاری میں اللہ پر توکل میں گزرا۔ حضرت استاد محترم مولانا عبید اللہ سندھی کی دلی خواہش تھی کہ میں آزاد حیثیت میں کام کروں اور ان کی تحریک اور پروگرام کی اشاعت کروں۔ ایک مرتبہ دہلی سے بھی انہوں نے مجھے اسی مضمون کا ایک خط لکھا تھا۔ آخر ان کی وفات کے بعد یہ آرزو پوری ہوتی۔ میں روزنامہ آزاد کے ذریعے اپنی بساط کے مطابق اپنے آزادانہ خیالات سے مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی خدمات انجام دیتا رہا ہوں"۔

(تالیف ڈاکٹر ابو سلمان سندھی)

مولانا عبید اللہ صاحب

مکہ معظمہ میں چند ملاقاتیں

ہمارے سندھ دیش کے بہت مشہور عالم، فاضل، محدث، مفسر، الحاج مولانا عبید اللہ جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ سیال کوٹ (پنجاب) کے ایک گاؤں میں ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوتے لیکن اللہ تعالیٰ نے سکھ گھرانے میں پیدا ہونے والے اس بچے کو اسلام کی خدمت کے لیے چن لیا تھا۔ ابھی وہ چھوٹے ہی تھے۔ اسلام کی سچائی نے ان کے دل میں نقش کر لیا تھا۔ بھرچونڈی شریف کے سید العارفین حافظ محمد صدیق کے ہاتھ پر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ پھر کچھ عرصہ شیخ الزماں خلیفہ غلام محمد دین پوری کی خدمت میں گزارا۔ اس کے بعد قطب زماں مولانا تاج محمود صاحبؒ کے پاس امروٹ شریف میں آ رہے۔ انہوں نے اس نو مسلم بچے کی اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیا۔ حضرت امروٹی کے چوں کہ کوئی فرزند نہیں تھا اس لیے وہ عبید اللہ کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا سندھی دارالعلوم دیو بند تشریف لے گئے۔ اور تھوڑا تھوڑا عرصہ انہوں نے لکھنؤ، رام پور، گنگوہ اور دہلی کے بعض اساتذہ کی خدمت میں گزارنے کے بعد دوبارہ دارالعلوم دیو بند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی کی خدمت میں زانوے ادب تہ کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا سندھ لوٹ آئے۔ جب آپ بھرچونڈی شریف پہنچے تو اس سے دس روز قبل حضرت سید العارفین کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھرچونڈی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد مولانا امروٹ شریف چلے آئے جہاں مولانا تاج محمودؒ ان کے منتظر تھے۔

مولانا تاج محمود علیہ الرحمۃ نے ان کو ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ ان کے مطالعے کے

لیے کتابوں کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا اور ایک پریس بھی لگا دیا جس سے مولانا نے "ہدایت الاخوان" کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ یہاں مولانا سندھی کا زیادہ وقت تصنیف و تالیف اور مطالعہ و غور و فکر میں گزرتا تھا۔ انہیں شاہ ولی اللہ کی تصنیفات سے خاص شغف تھا۔ اسی مطالعے کی روشنی میں انہوں نے اپنی آئندہ سیاسی زندگی کا پروگرام مرتب کیا تھا۔ لیکن مولانا سندھی جیسے صاحب ہمت کے لیے امروٹ شریف کی فضا بہت تنگ تھی۔ وہ اپنی تگ و تاز کے لیے ایک وسیع میدان کے متلاشی تھے۔ شیخ الہند کی صحبت نے ان میں انقلاب کی روح پھونک دی تھی اور ایک لائحہ عمل کی طرف رہنمائی کر دی تھی۔ اب ان کے سامنے سندھ کے پیروں اور خانقاہ نشینوں میں حریت کی اس روح کو بیدار کرنا تھا۔ اسی کے لیے انہیں پیر جھنڈے کے راشدی خاندان کی سرپرستی میں مدرسہ دارالرشاد کا قیام مقاصد کار کے لئے زیادہ مفید نظر آیا۔ پیر جھنڈا جہاں عارف باللہ سید ابو تراب محمد رشد اللہ صاحب العلم قدس سرہ سجادہ نشین تھے۔ مولانا سندھی ان سے ملے اور پہلی ہی ملاقات میں انہیں اپنا گرویدہ اور اپنے سیاسی و مذہبی نصب العین کا متفق بنا لیا اور طے پا گیا کہ ایک بڑے پیمانے پر ایک مدرسہ قائم کیا جائے گا۔ حضرت رشد اللہ صاحب العلم ایک زبردست عالم اور بہت بڑے شیخ تھے اور مسلمانوں کی اصلاح و انقلاب حال کا ایک قوی داعیہ رکھتے تھے۔ مدرسے کے تمام اخراجات کا بار انہوں نے اپنے سر لے لیا اور مدرسہ کے نظم و نسق کی پوری ذمہ داری مولانا سندھی کے سپرد کر دی۔ حضرت پیر صاحب نے سندھ میں دورہ کر کے مدرسے کے لیے ایک خطیر رقم فراہم کر دی اور مولانا عبید اللہ سندھی نے دیوبند اور پنجاب سے بڑے بڑے علماء اور ماہرین علوم اسلامی کو مدرسہ میں جمع کر دیا اور پیر جھنڈا کے ایک چھوٹے سے گوٹھ کو ایک عظیم الشان تحریک کا مرکز بنا دیا۔

شروع میں مولانا سندھی نے دس سال تک مدرسے کو چلانے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ جب دس سال پورے ہوتے تو مولانا سندھی نے اجازت چاہی۔ اگرچہ پیر جھنڈا

کے بزرگ انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ پروگرام کے مطابق اب اگلا قدم اٹھانا ضروری ہے اور ان کے یہاں سے ہٹ جانے سے مدرسے کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور وہ اس کے نصب العین کی نگہداشت کرتے رہیں گے تو انہوں نے اجازت دے دی۔ حضرت مولانا سندھی حضرت شیخ الہند کی دعوت پر دیوبند تشریف لے گئے اور جمعیتہ الانصار کے قیام سے اگلے مرحلے کے کام کا آغاز کر دیا۔ دیوبند میں مولانا سندھی تین سال تک کام کرتے رہے۔ پھر ان کے کام کا مرکز دیوبند سے دہلی منتقل ہو گیا، جہاں انہوں نے نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے جامع مسجد فتح پوری میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ دیوبند کی جمعیتہ الانصار میں اور دہلی کے نظارۃ المعارف میں مولانا سندھی جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کی روشنی میں قرآن حکیم کی تعلیم دیتے تھے۔

دیوبند کی جمعیتہ الانصار نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۱۱ء میں مراد آباد میں اس کا پہلا عظیم الشان جلسہ ہوا، جس نے نہ صرف تمام ملک کے اصحاب نظر و بصیرت کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ بلکہ برٹش حکومت بھی اس عظیم الشان اجتماع سے متاثر ہوئی۔ دوسرا سالانہ جلسہ ۱۹۱۲ء میں میرٹھ میں ہوا۔ اس سے جمعیتہ الانصار کی پورے ملک میں دھوم مچ گئی اور مولانا سندھی کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہو گیا۔ لیکن اب برٹش حکومت کے کارندوں نے مولانا سندھی کے کاموں میں کئی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں اور آزادی کے ساتھ کام کرنا مشکل بنا دیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہند کے ایما سے ان کا کام دہلی منتقل کر دیا گیا۔ دہلی میں انہیں تقریباً دو سال کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور اس مدت میں انہوں نے ملک کے اہل علم اور ارباب تدبر و بصیرت میں بہت اعتماد پیدا کر لیا تھا۔

اب وقت آ گیا تھا کہ پیش نظر انقلابی منصوبے کے اگلے مرحلے میں قدم رکھا جائے۔ جنگ عظیم اول چھڑ چکی تھی۔ انگریز ملک میں کسی قیمت پر بدامنی اور انتشار

برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مولانا سندھی کی انگریز دشمنی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہ رہی تھی۔ ان کے لیے ہر طرف خطرات موجود تھے۔ حضرت شیخ الہند نے انہیں افغانستان جانے کا حکم دیا۔ مولانا سندھی دہلی سے سندھ آتے اور کچھ عرصے تک کراچی، امروٹ شریف، دین پور شریف، پیر جھنڈا، ٹلاہ، جیکب آباد میں گھومتے پھرتے رہے اور افغانستان جانے کے انتظامات کرتے رہے اور پھر ایک روز خاموشی کے ساتھ سبی کے راستے افغانستان چلے گئے۔ افغانستان میں مولانا تقریباً سات سال مقیم رہے، اس دوران میں سیاست میں سرگرم حصہ لیا، ہندوستان کی پہلی آزاد حکومت قائم کی، جنود اللہ (ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے والی فوج) قائم کی، ریشمی خطوط کے ذریعے ہندوستان اور حجاز میں انقلابیوں سے رابطوں کا انتظام کیا، انگریزوں کے خلاف افغانستان کی جنگ آزادی میں عملاً حصہ لیا اور جب انگریزوں اور افغان حکومت میں معاہدے کے بعد افغانستان کا قیام ناممکن ہو گیا تو ستمبر ۱۹۲۲ء میں روس چلے گئے اور روسی نظام حکومت اور اشتراکیت کا مطالعہ کیا جولائی ۱۹۲۲ء میں مولانا نے ترکی کا سفر اختیار کیا اور وہاں بیٹھ کر ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل تجویز کیا، جو سرور اجی پروگرام کے نام سے شائع ہوا۔ ترکی میں تین سال کے قیام کے بعد ۱۹۲۶ء میں مولانا سندھی حجاز تشریف لے گئے۔ اس وقت سے اب تک وہ نہایت خاموشی کے ساتھ مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں اور اپنا سارا وقت درس و مطالعہ میں صرف کرتے ہیں وہ اگرچہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہیں لیکن مسافرین حجاز اور اخبارات اور کتب و رسائل کے ذریعے سے وہ ہندوستان کے سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر ہیں اور نہایت صائب رائے رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم اور امام ولی اللہ کے علوم و معارف ان کے مطالعہ و نظر کا خاص موضوع ہیں وہ قرآن حکیم طلبہ کو پڑھاتے ہیں اور اسلامی احکام کے بارے میں اگر کسی کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا ہوتی ہے تو قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں انہیں حل کر دیتے ہیں۔ حرمین شریفین میں آج ان کے پائے کا کوئی عالم دین موجود نہیں۔ ۱۹۳۳ء میں جب مجھے حج کی سعادت

نصیب ہوئی تھی تو اس وقت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات میں سے موطا کی شرح کی پہلی جلد پریس میں تھی۔ جو مولانا نے میری واپسی کے بعد ڈاک کے ذریعے میرے نام پر روانہ فرمائی اور دوسری جلد دوسرے سال مولوی حافظ محمد محسن سہارن پوری کے ہاتھ روانہ فرما کر شکر گزار کیا اور اس پر اپنے قلم سے یہ یادگار جملہ تحریر کیا "تذکار المحبتہ للشیخ دین محمد الوفائی، من عبید اللہ" مولوی دین محمد وفائی کی محبت کی یادگار عبید اللہ کی طرف سے۔

مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران میں خاکسار ایڈیٹر توحید کی مولانا سندھی سے تین ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے دو ملاقاتیں حرم شریف میں اور ایک منیٰ میں۔ سب ملاقاتیں علمی تھیں۔ سیاست کے بارے میں مولانا کا خیال تھا کہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے بعد سندھ کے مسلمان متوقع فوائد حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے کہ ان میں تعلیم کا اوسط بہت کم ہے۔ البتہ تعلیم عام ہونے کے بعد مسلمان زیادہ فوائد حاصل کر سکیں گے۔

قرآن حکیم کی تعلیم کے بارے میں مولانا صاحب نے فرمایا کہ اسے سمجھنے کے لیے شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات کا مطالعہ خاص طور پر حجتہ اللہ البالغہ اور الفوز الکبیر کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں نے پہلے جو قرآن پڑھا اور سمجھا تھا، یورپ کے سفر کے بعد اس میں بہت رسوخ اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

مولانا صاحب کو وطن واپس آنے، خصوصاً سندھ میں آنے کا بہت اشتیاق ہے۔ مگر برٹش حکومت کی پابندیوں نے انہیں مجبور و بے بس کر رکھا ہے۔ مولانا کی عمر اب کافی ہو گئی ہے، لیکن ان کی صحت اچھی اور جسم مضبوط ہے۔ عصر کی نماز کے بعد سے روزانہ شام کی نماز تک مسجد حرم میں بیٹھتے ہیں اور وہیں دوستوں اور ملاقات کے شائقین سے ملاقات کرتے ہیں۔ ان کی رہائش ایک ہندوستانی نواب کی رباط میں ہے۔ انہیں دو کمرے ملے ہوتے ہیں، جہاں ان کا وقت تحریر و مطالعے میں صرف ہوتا ہے اور رات کو

سوتے ہیں۔

مولانا صاحب جب سندھ میں آئیں گے اور یقین ہے کہ وہ دن جلد ہی آئے گا تو سندھ کے نوجوانوں کو ان کے علم اور ان کی صحبت سے .بہت فائدہ پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے ، وہ سندھ تشریف لائیں اور ان کے عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کو ان کے علم و صحبت سے .بہرہ مند ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

(توحید۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۳۷ء)

ترجمہ اکرام الدین۔ شہداد کوٹ سندھ

مولانا عبید اللہ کی رفاقت میں کچھ وقت

حیدر آباد میں جمعیتہ العلماء کے اجلاس کے بعد میں کراچی چلا آیا اور حضرت مولانا عبید اللہ صاحب دارالرشاد روانہ ہو گئے ۔ مجھے کراچی میں معلوم ہوا کہ مولانا صاحب بیماری کے عالم میں دارالسعادت گورو پہوڑ تشریف لے گئے ہیں۔ اس دوران میں ۱۱۔ مئی کو مجھے سکھر آنے کا اتفاق ہوا ۔ مولانا صاحب سے شرف ملاقات کا بے حد اشتیاق تھا۔ سکھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ امروٹ شریف تشریف لے گئے ہیں۔

----- مئی کو امروٹ شریف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر جو بات سب سے پہلے معلوم ہوئی وہ یہ تھی وڈیرے ہدایت اللہ خان دل نے محمد قاسم ولی اللہ اسکول کے لیے مولانا کو چھ جریب قطعہ اراضی دیا ہے اور نقشہ لے کر آپ زمین کے معائنے کے لیے گئے ہیں۔

امروٹ شریف میں پہلے دن میں اپنے دوست حکیم سید امیر علی شاہ کا مہمان تھا۔ اس سفر میں حکیم فتح محمد لکھوی بھی میرے ہمراہ تھے۔ نماز ظہر کے بعد جب ہم درگاہ گئے تو معلوم ہوا کہ مولانا صاحب صبح گیارہ بجے پہلی بار قطعۂ اراضی دیکھنے گئے تھے نقشہ بھی ساتھ تھا، لیکن عدم واقفیت کے سبب سے مقام تک نہ پہنچ سکے تھے۔ اس لیے واپس آ گئے تھے اور اب دوبارہ سخت گرمی میں چار بجے روانہ ہوتے ہیں۔ ابھی تک واپس نہیں آتے ہیں۔ اسی دوران میں کسی نے آ کر بتایا کہ مولانا کے خادم مولوی عبدالمجید جو ان کے ہمراہ گئے تھے۔ پانی اور برف لینے آتے ہیں اور مولانا صاحب شہر سے نصف میل دور حفاظتی بند کے ساتھ ایک درخت کے نیچے سو رہے ہیں۔

حکیم سید امیر علی شاہ اور ہم سخت گرمی اور حبس میں مولوی عبدالمجید کے ہمراہ گاؤں کے باہر اس درخت کے نیچے پہنچے، جہاں علم، فلسفہ، حکمت اور حکمت کا بحر بے پایاں ناہموار زمین پر برہنہ سر محو آرام تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بیماری کے عالم میں بھی اس بزرگ کو کام کیے بغیر آرام نہیں آتا۔ ان کی زندگی "عمل" کی صورت اختیار کر چکی ہے اور وہ قومی اور ملکی محبت میں اتنے مصروف ہیں کہ اپنی شدھ بدھ بھی نہیں رہی ۔ فارسی کے ایک شاعر کے بقول:

محبتی ست کہ دل را نمی دہد آرام
وگرنہ کیست کہ آسودگی نمی خواہد

۱۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ برف کے ٹکڑے ان کے سر اور سینے پر رکھے گئے۔ فرمایا بہت اچھا ہوا تم یہاں آ گئے۔ میں نے تم لوگوں کے لیے شکار پور اور سکھر کے دوستوں کو بھی خط لکھے تھے کہ مجھ سے آ کر ملیں۔

۲۔ اس کے بعد ہم لوگ جنگل سے درگاہ آئے جہاں مولانا صاحب کے قیام کا بندوبست تھا۔ ارشاد فرمایا کہ شمالی سندھ میں ولی اللہی فلسفہ کی تعلیم کے لیے ایک اسکول کے قیام کی شدید ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے وڈیرہ مستی خان مرحوم کی اولاد نے مجھے قطعہ زمین دے دیا ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اسکول کھول دیا جائے گا۔ مرحوم مستی خان کے بارے میں فرمایا کہ وہ حاکم شہر تھے اور ان کی منشاء و مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی مجھ سے ایسی شفقت تھی جیسی اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ مجھے کسی شے کی ضرورت ہوتی اور مرحوم مستی خان کو اس کا پتا چل جاتا تو بلا تاخیر وہ ضرورت پوری کر دی جاتی تھی۔ وڈیرہ لطف اللہ خاں ولد مرحوم وڈیرہ مستی خان کی بھی مجھ پر بڑی عنایتیں ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب میں سندھ سے عازم کابل ہوا تھا تو وہ راز زبان پر لانے کے قابل نہیں ہیں۔ فرمایا کہ امروٹ کے نوجوان وڈیرے میرے ہیں۔ یہ میرے دوستوں کی اولاد ہیں۔ یہ میرا اپنا گاؤں ہے۔ انہوں نے مجھے بہت خوش رکھا

ہے اور میں ان کے لیے دعائیں کرتا ہوں۔

۳۔ فرمایا کہ میں میاں نظام الدین شاہ سجادہ نشین سے بہت خوش ہوں۔ وہ سخی ہیں، جماعت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مرشدوں کا مکان آباد ہے اور یہ ایک بڑی خوبی ہے، جو میاں صاحب میں موجود ہے۔

۴۔ گوروپھوڑ کے مدرسے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ طلبہ کے تنظیمی امور مولانا غلام مصطفیٰ صاحب کے حوالے کیے ہیں۔ مدرسے کے مہتمم حافظ عبدالغنی شاہ طلبہ کی خوراک کا انتظام بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ وہ بھلے انسان ہیں۔

اس مدرسے کے کچھ طلبہ نے جو جلد ہی اپنی تعلیم مکمل کرنے والے ہیں۔ شہداد کوٹ میں ایک جگہ خرید کر ایک مدرسہ کھولنے کا عزم کیا ہے۔ جہاں ولی اللّٰہی تصنیفات کی تعلیم دی جائے گی۔

۵۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ میں نے سندھ کے علاوہ ہندوستان، یورپ اور اسلامی ممالک کا سفر کیا ہے لیکن سندھ جیسے اچھے لوگ کہیں بھی نہیں ہیں۔ سندھ میں کتنے ہی صوفی بزرگ اور بڑے بڑے عالم گزرے ہیں۔ ان کی تربیت اور صحبت کا اثر آج تک سندھی مسلمانوں کی نسلوں میں موجود ہے۔ ایسے مہمان نواز اور فرماں بردار لوگ کہاں مل سکتے ہیں؟

۶۔ ایک بار ارشاد فرمایا کہ سندھ کے سادات کو چاہیے کہ خود کو ملک کا خادم کہلوا کر کام کرتے رہیں۔ بلکہ خود کو سید نہ کہلوائیں تو بہتر ہے۔ بہ صورت دیگر کچھ خفیہ طاقتیں ایسی بھی منظر عام پر آئیں گی جو سادات کو پے در پے تکالیف پہنچا کر انہیں زچ کر دیں گی۔ اس لیے انہیں سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ مجھے جی۔ ایم۔ سید ملے تو اس بارے میں انہیں کچھ بتاؤں گا۔

۷۔ فرمایا کہ پچھلے دنوں پیر جھنڈا شریف میں جب میں شدید بیمار ہوا دوست احباب نا امید ہو چکے تھے۔ اس عالم ناامیدی میں ان سے کہا تھا کہ مجھ میں ابھی "جوہر حیات" موجود

ہے ۔ اس لیے میں ابھی نہیں مرنے والا۔ آپ لوگ کیوں گھبراتے ہیں۔ اس کے بعد صحت بحال ہو گئی۔

۸۔ سید امیر علی شاہ نے عرض کیا کہ عارضہ کیا ہے؟ فرمایا کہ طبیبوں کو معلوم ہو گا۔

مولانا صاحب میں قوت برداشت اتنی ہے کہ کسی سے بھی بیماری کا علاج نہیں کراتے ہیں اور نہ ہی کسی کو کچھ کہتے ہیں۔ کوئی حکیم خود آ جاتے اور کچھ علاج بتلاتے تو کر لیتے ہیں۔ ورنہ ان کی عادت تھی کہ کسی کو زحمت نہ دیتے تھے۔ ہم نے بارہا انہیں سخت اذیت کی کیفیت میں دیکھا۔ اس عالم میں ان کے منہ سے صرف اللہ اللہ کا لفظ نکلتا تھا اور کچھ نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ تصوف کے طریقوں پر چلنے سے انسان میں قوت برداشت ، صبر اور استقلال کی عظیم قوت پیدا ہو جاتی ہے ۔ ایک انقلابی شخص کے لیے تصوف کی منازل طے کرنا لازم ہے۔

امروٹ شریف کے وڈیروں والی مسجد کے بارے میں فرمایا کہ اصل میں یہ چھوٹی سی مسجد تھی۔ بعد میں حضرت صاحب (قطب العارفین مولانا سید تاج محمود صاحب قدس سرہ) کے مشورے پر وڈیرے مستی خان مرحوم نے اسے وسعت دینے کا ارادہ کیا۔ مسجد کی بنیاد کی پہلی اینٹ حضرت کو خود رکھنی تھی لیکن وہ باہر گئے ہوتے تھے اس لیے وڈیرے نے مجھ سے رکھوالی۔ مسجد تعمیر ہونے کے بعد حضرت صاحب سے یہ وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ جمعہ اسی مسجد میں پڑھائیں گے۔ اور یہ وعدہ ہمیشہ قائم رہا۔ مستی خان وڈیرے کی وفات کے بعد بھی جمعہ اسی مسجد میں پڑھتے رہے۔

میں آخری رات کو امروٹ شریف میں اپنے دوست وڈیرے ہدایت اللہ خان دل کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی رات چار بجے صبح مولانا کے ہمراہ روانہ ہونا تھا۔ وڈیرہ بھی ازراہ مہربانی میری خاطر اس رات اوطاق ہی میں ٹھہرے رہے۔ میں جب رات کے آخری پہر مولانا کو جگانے گیا تو دیکھا کہ آپ جاگ رہے ہیں ۔ فرمایا کہ رات ایک بجے

میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے بعد بالکل نہیں سویا ہوں۔

تانگے میں سوار ہونے کے بعد مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ فرمایا کہ مولوی محمد انور شاہ صاحب (کشمیری) دیوبندی مرحوم حنفی فقہ کے جید عالم تھے۔ مگر ان کے استدلال کا سارا انحصار امام محمد طحاوی مصری متوفی ۱۲۳ھ کی کتاب پر تھا۔ بعض امور میں حضرت شیخ الہند محمود حسن صاحب طحاوی کے دلائل قبول نہ فرماتے تھے۔ جس کے باعث ہم لوگوں کے لیے بڑی مشکل ہوتی تھی۔ آخر فقہ حنفی کی احادیث سے مطابقت کے لیے شیخ الہند نے شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کی جانب اشارہ فرمایا۔ جس کے بعد مشکلات حل ہو گئیں۔

مولانا نے فرمایا کہ میں نے طحاوی کی کتاب معانی الآثار پر مفصل حاشیہ لکھا تھا اور کتاب کی تلخیص بھی کی تھی۔ اس ضمن میں مجھے نیل الاوطار قاضی محمد بن علی شوکانی کی کتاب سے بہت مدد ملی۔ نیل الاوطار بہت مفید کتاب ہے، جسے میں نے بارہا پڑھا ہے۔ میرے استفسار پر فرمایا کہ طحاوی پر حاشیہ کے مسودات امروٹ میں تھے۔ شاید وہ ضائع ہو گئے ہوں گے۔

فرمایا کہ فقہ حنفی کو حدیث سے تطابق میں لانے پر کامل سات برس محنت کی اس کے بعد کامیابی ہوئی۔ اس مقصد کے لیے حضرت صاحب امروٹ والوں نے میرے کے لیے بہت ساری کتابیں جمع کیں۔ اس کے علاوہ پیر جھنڈا والوں کے کتب خانے سے نایاب کتب مطالعے کے لیے ملیں۔ امروٹ شریف میں قیام کا دور کتابوں کے مطالعے میں گزرا۔

فرمایا کہ حضرت صاحب امروٹ والوں نے حنفی فقہ کے امام ابو زید ربوسی کی کتاب الاسرار کا قلمی نسخہ شکارپور سے مہیا کیا جس سے فقہ حنفی کا اپنے اساتذہ والا اصلی مسلک معلوم ہوا۔ فقہ میں بنیادی کتب یہی ہیں۔ باقی مدرسوں میں جو پڑھائی جاتی ہیں۔ وہ تو صرف تمہید ہیں۔

صبح کی نماز رک اسٹیشن پر پڑھی۔ گاڑی لیٹ تھی جس کے لیے کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ شکار پور کے چند افغان ٹھیکیدار آپ سے ملاقات کے لیے آتے ہوتے تھے۔ انہیں وصیت فرمائی کہ قرآن شریف کا ترجمہ سیکھیں۔ فرمایا کہ ایک فقیر سفر کرتا کرتا مارواڑ جا پہنچا۔ گلے میں قرآن شریف لٹکائے ہوتے تھے۔ وہ مارواڑی ہندوؤں کے گاؤں میں پہنچا اور پانی پیا۔ اس سے مارواڑیوں نے پوچھا کہ تمہارے گلے میں کون سی کتاب لٹکی ہوئی ہے۔ فقیر نے کہا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ہندوؤں نے کہا ہمیں پڑھ کر سناؤ فقیر نے اسے کھولا اور کچھ پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے پوچھا کہ اس میں کیا کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ معنی تو مجھے نہیں آتے۔ وہ افسوس کرنے لگے کہ اللہ کا کلام تو سن لیا پر مطلب معلوم نہ ہو سکا۔ فرمایا اگر فقیر کو معنی آتے تو نہ معلوم کتنا فائدہ ہوتا۔

ایک شخص نے مجھ سے استفسار کیا۔ کہ فلاں مولوی وید اور قرآن دونوں کو ایک جیسا کلام الٰہی مانتا ہے، یہ تو کفر ہے۔ مولانا صاحب یہ الفاظ سن کر غصے میں آ گئے اور فرمایا کہ یہ ہندوستانی مسلمان اگر ہندوستان کو اپنا وطن نہیں مانتے تو یہاں سے نکل کر کسی دوسرے ملک میں کیوں نہیں چلے جاتے۔ حضرت ابراہیم کے دین حنیف سے پہلے ایک دوسرا دور تھا۔ اس دور کے لحاظ سے اگر وید کو الہامی کتاب کہہ دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ حضرت ابراہیم کی ذہنی ترقی والے دور میں بہت پچھلی باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ مزید فرمایا کہ کوئی بھی مذہب یا دھرم انسانی وحدت سے منکر نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً قرآن شریف نے تو وحدت انسانی پر بہت زور دیا تھا۔ اس کیفیت میں انسانیت کا مذہب بھی اصولی طور پر وہی ہو گا۔ باقی جو فروعی اختلاف ہوں گے وہ عہد، زبان اور قوموں کے رواجوں کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ ورنہ خدائی مذہب ہر دور اور ہر مقام پر یکساں شے ہے۔

فرمایا کہ آثار قدیمہ کی کھدائی سے جو کتبات یا مخطوطات دستیاب ہوتے ہیں۔ ان سے محققین نے ثابت کیا ہے کہ حضرت نوحؑ اور منو شاستر کے قوانین تقریباً ایک جیسے

ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ گزشتہ برس ہندوستانی مذاہب اور ان سے مسلمانوں کے تعلق پر کئی کتابیں میرے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ فرمایا کہ اس پر کچھ لکھو تاکہ اہل سندھ مستفید ہوں۔

اس کے بعد میں سکھر اتر گیا اور مولانا خلیفہ عبدالعزیز صاحب کی جانب تھری جانی چلے گئے۔ دو دن بعد واپس آکر سکھر میں ڈاکٹر محمد عمر کے مہمان ہوئے۔ بیماری کے باعث طبیعت ناساز اور کمزور تھی۔ رات آرام سے گزری ڈاکٹر صاحب وہ خدمت انجام دیتے رہے، جسے صحیح معنی میں خدمت کہا جاتے۔ اس ڈاکٹر صاحب کو بہت دعائیں دیتے رہے۔ فرمایا ڈاکٹر محمد عمر کے والد احمد صاحب مرحوم اور ان کے چچا مولوی عبدالعزیز صاحب حضرت امروٹی کے ابتدائی مصاحب اور دوست ہیں (اس وقت میاں جی عبدالعزیز موجود تھے)۔ مولوی احمد کو مجھ سے بہت قربت تھی، پل بھر کو جدا نہ ہوتے تھے۔ یہ میرے دوستوں کی اولاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں برکت دی۔ ڈاکٹر کے بڑے بھائی مولوی محمد عثمان نواب شاہ میں رہتے ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً چپ چاپ میری مدد کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ سندھ میں میرے دوست اور ان کی اولادیں اب بھی میرے ساتھ تعلق رکھے ہوئے ہیں اور مجھے مانتے ہیں۔

صبح کے وقت اخبارات آگئے۔ فرمایا کہ لاہور کا مسئلہ کیسے جا رہا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ وزیر اعظم خضر حیات کو مسلم لیگ سے نکال دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو لوگ لاہور کے مسئلے کو نہیں سمجھ سکتے، انہیں مسلمانوں کی قیادت کا کوئی حق نہیں ہے۔ در حقیقت انگریزوں کا مرکزی شہر ہندوستان میں دہلی نہیں، لاہور ہے۔ انگریز لاہور کی سیاست کو براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے لاہور کو سمجھنے کے لئے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

فرمایا کہ اخبار انقلاب کے ایڈیٹروں نے مسٹر جینا کے خلاف مختلف اخبارات کے

فائل جمع کر لیے ہیں، وہ جب لاہور (پنجاب) کے مسئلے میں دست اندازی کریں گے تو پنجاب کا مسلم پریس پوری طاقت سے مسٹر جینا کا مقابلہ کرے گا۔

مسٹر جینا ابھی لاہور سے پوری طرح ناامید نہیں ہوتے ہیں۔ جب پوری طرح ناامید ہو جائیں گے تو انگریزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ گذارش کی گئی کہ لاہور چھن گیا تو پاکستان کا مرکز کہاں ہو گا؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ آخر پاکستان میں جو قرآنی حکومت قائم کریں گے وہ کیسی ہو گی؟ مسٹر جینا نے عالموں کو تو (جو قرآن کے اسرار و رموز سے واقف ہیں) دھتکار دیا ہے۔ عالموں کے سوا قرآنی حکومت کی تشکیل کون کر سکتا ہے؟

گذارش کی گئی کہ ہندوستان میں حکومت الہیہ کا جو پروگرام تجویز کیا جا رہا ہے، وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ بازیچۂ اطفال ہے۔ برطانوی شہنشاہیت میں کہیں حکومت الہیہ کا امکان ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ہندوستان کی قومی تحریکوں کے اثرات کو ذہنوں سے محو کرنے کے لیے یہ کھلونے سامنے لائے جا رہے ہیں۔ ان کے اندر حقیقت کچھ بھی نہیں۔

(توحید۔ کراچی، جون ۱۹۴۴ء)

ترجمہ۔ پروفیسر محمد یاسین شیخ۔ کراچی

امام مولانا عبید اللہ سندھی

خدمات پر ایک نظر

حضرت امام سندھی سے پہلی ملاقات:

۱۹۳۴ء میں مارچ کی ۲۸ تاریخ کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب میں حکیم محمد معاذ صاحب کے ساتھ بیت اللہ الحرام میں نماز ظہر ادا کرنے اور طواف کعبہ کے لیے ایک دروازے سے داخل ہو رہا تھا اور سامنے سے حضرت امام مولانا عبید اللہ سندھی قدس سرہ باہر جانے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ حضرت نے سب سے پہلے حکیم محمد معاذ سے مخاطب ہو کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت فرمایا' یہ مولوی وفائی صاحب ہیں نا؟ حکیم صاحب نے اثبات میں جواب دیا' ہاں۔

منیٰ کی ایک یادگار ملاقات:

اس کے بعد متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور حج ادا کرنے کے بعد منیٰ کے دوران قیام میں ایک طویل علمی ملاقات ہوئی۔ جس میں مؤطا امام مالک کے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہونے کی حیثیت اور احادیث کی مختلف قسموں کو سمجھاتے رہے تھے۔ سندھ میں کام کرنے کی ضرورت اور اہمیت پر گفتگو فرمائی اور اس بات پر خاص زور دیا کہ دیہاتیوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جائے اور انہیں ووٹ کی اہمیت سے آشنا کیا جائے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دیہات میں کام اور دیہاتیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا وطن واپسی کے بعد ان کے پروگرام کا اہم حصہ ہے۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آ گئے تو اپنی مجلسوں میں

سیاسی کارکنوں کو دیہات میں کام کرنے دیہاتیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے اور انہیں ووٹ کی اہمیت سمجھانے کی خاص ہدایت اور تاکید فرماتے تھے۔

وطن واپسی کی تحریک:

حضرت امام کی وطن واپسی کے لیے ملک میں جو کوشیں ہو رہی تھیں، ان میں سر حاجی عبداللہ ہارون، شیخ عبدالمجید (سندھی) اور انقلاب، لاہور کے ایڈیٹر مسٹر غلام رسول مہر کا خاص حصہ ہے۔ سر عبداللہ ہارون نے مرکزی اسمبلی میں حضرت امام کی وطن واپسی کے متعلق بار بار سوالات کیے اور انقلاب لاہور اور الوحید کراچی میں (جس کا میں خود ایڈیٹر تھا) اس مسئلے پر بار بار ایڈیٹوریل لکھے گئے اور مضامین شائع کیے گئے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اسمبلی میں سوالات کے جوابات بھی شائع ہوتے اور ان پر نقد و تبصرہ کے ذریعے اس مسئلے کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا رہا۔

یہ تحریک ۱۹۳۷ء سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن جب ۱۹۳۷ء میں انتخابات کے بعد ملک کے بیشتر صوبوں میں کانگریس جیت کر برسر اقتدار آئی اور صوبہ سندھ میں اللہ بخش سومرو شہید نے حکومت بنائی تو اس تحریک میں گویا نئی جان پڑ گئی۔ کانگریس کمیٹی سندھ کے صدر ڈاکٹر چوتھ رام گڈوانی نے اس مسئلے میں حکومت سے خط و کتابت کی اور اس کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ حکومت حضرت امام سے خوف زدہ ہے کہ وہ تشدد اور طاقت کے ذریعے انقلاب پر یقین رکھتے ہیں تو انہوں نے مولانا سندھی سے بھی خط و کتابت کی۔ چوں کہ مولانا اپنے تجربات و مشاہدات اور مطالعہ و غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اب ملک سے باہر رہنے کے مقابلے میں ان کی ملک کے اندر زیادہ ضرورت ہے تو انہوں نے ڈاکٹر چوتھ رام گڈوانی کے نام خط میں اس بات کا صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ

۱۔ وہ آئندہ کانگریس میں شامل ہو کر اس کے عدم تشدد کی پالیسی کے پابند رہیں

گے اور

۲۔ ملک و بیرون ملک کی انتہا پسند قوتوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔

اس کے بعد حکومت کے لیے ان پر سے پابندی نہ اٹھانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ حکومت مجبور ہو گئی کہ وہ مولانا سندھی مرحوم کو وطن میں آنے کی اجازت دے۔ حکومت نے اپنے طور پر بھی اس بات کی تصدیق کر لی تھی۔ ایک دفعہ مولانا نے فرمایا:

"مکہ شریف میں برٹش حکومت کے آدمیوں نے مجھ سے آکر پوچھا تھا کہ آیا میں ہندوستان واپس جانے کے بعد کیا کروں گا؟ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ کانگریس کی عدم تشدد کی پالیسی کا پابند رہوں گا۔ اگر حکومت میری گزشتہ زندگی کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھ پر اعتبار کرلے۔ یہ میرا اس سے پختہ وعدہ ہے۔ مزید کسی تحریری معاہدے کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہہ دینے کے بعد دو ماہ کے اندر مجھے وطن واپسی کی اجازت مل گئی"۔

مولانا سندھی کی وطن واپسی:

حضرت امام سندھی کو پاسپورٹ دے دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد ہندوستان روانہ ہو گئے ان کا جہاز کراچی پورٹ پر لنگر انداز ہوا تو ہزاروں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کا نہایت گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ سندھ کے وزیر اعظم اللہ بخش شہید بہ نفس نفیس استقبالیوں میں شامل تھے۔ دیگر حضرات میں کانگریس کمیٹی سندھ۔ جمعیت علما اور مسلم لیگ صوبہ سندھ کے رہنما شامل تھے۔ شیخ عبدالمجید (سندھی) سے حضرت امام کا سامنا ہوا تو ان سے پوچھا۔ مولوی وفائی کہاں ہیں؟ میں اس موقعہ پر موجود تھا لیکن مجھے اس وقت تک ہجوم کی وجہ سے حضرت تک پہنچنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ جب ہجوم کم ہوا تو میں نے حضرت امام کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ وہاں سے حضرت اپنے رفیق قدیم مولانا محمد صادق کے مکان پر (محلہ کھڈا میں) تشریف

لاتے ۔ جہاں حضرت کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں صبح سے شام تک لوگوں سے ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ مختلف طبقات کے لوگ ملاقات کے لیے تشریف لاتے تھے۔ علمائے دین، سیاسی رہنما، سماجی کارکن، طلبہ، ہندو، مسلمان، سکھ ملاقات کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ حیرت سے اس عظیم انقلابی کو دیکھتے تھے اور اپنی عقیدتوں کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔

جمعیت خدام الحکمتہ کا قیام:

سندھ پہنچنے کے بعد حضرت امام مسلسل ۳ ماہ تک مولانا محمد صادق صاحب کے مکان پر محلہ کھڈا میں مہمان رہے۔ اس کے بعد دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) لاہور، دہلی کے سفر پر روانہ ہوتے اور جب واپس آتے تو پہلے دارالرشاد میں اور پھر مظہر العلوم میں انہوں نے سندھ ساگر پارٹی کی بنیاد رکھی اور اس کا دستور العمل شائع کیا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"آج بہ روز یک شنبہ ۱۲۔ ذی القعدہ الحرام ۱۲۵۸ھ ۲۴ دسمبر ۹۳۹ ہندی دارالرشاد میں (اور ۱۶۔ ذی قعدہ کو مظہر العلوم کراچی میں) جمعیۃ العلماء کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جاتا ہے، جو اسلامی فلاسفی کا خادم اور محافظ ہو گا۔ اگر خدا کو منظور ہے تو وہ ایک سوچے سمجھے ہوئے دینی پروگرام پر چل کر مسلمانوں کا تشتت دور کر دے گا۔ واللہ الموفق والمعین۔

جمعیۃ خدام الحکمتہ کے اصول:

۱۔ جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے اراکین میں سے دارالرشاد کے علماء اور ان کے ساتھ مظہر العلوم کراچی کے علماء جمعیۃ العلماء سندھ میں ایک مستقل شعبہ کی تاسیس کرتے ہیں جس کا نام جمعیۃ خدام الحکمتہ ہو گا۔

۱۔ خدام الحکمتہ کے اساسی اصول نظری و عملی حسب ذیل ہوں گے۔

(الف) امام ولی اللہ دہلوی (حکیم الہند) کو جمیع علوم شرعیہ مثلاً کتاب و سنت و حکمت

وسیاست میں ۱۱۴۴ ہجری (۳۱ ہندی) سے امام الہند تسلیم کرنا۔

(ب) ان کی کتابیں (۱) الفوز الکبیر - فتح الرحمن - ازالۃ الخفاء (۲) حجۃ اللہ البالغہ، الموطا کی فارسی اور عربی شروح، مسوی - مصفی (۳) قول جمیل الطاف القدس - ہمعات (۴) سطعات - لمعات - البدور البازغہ - الخیر الکثیر - تاویل الاحادیث فیوض الحرمین - التفہیمات الالہیہ وغیرہ - ان کی اصلی زبانوں میں پڑھنے پڑھانے کو مقصد حیات بنانا۔

(ج) امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کی تشریح میں امام عبدالعزیز دہلوی کو امام ماننا اور مولانا رفیع الدین کی تکمیل الاذہان، مولانا محمد اسمعیل شہید کی عبقات، مولانا محمد قاسم نانوتوی دیوبندی کی تقریر دل پذیر اور شرح حدیث ابی زرین اور قبلہ نما کو بطور مبادی پڑھنا پڑھانا۔

ہندی سیاست کو ترقی دینے کے لیے سندھ ساگر پارٹی یا اسی منہاج کی مستقل پارٹی کو انڈین نیشنل کانگریس میں قائم رکھنا اور مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند کو اس سلسلہ کا استاد ماننا۔

(ہ) ج، ن، سندھ ساگر پارٹی کے مراکز سیاسیہ مثل دہلی، لاہور اور کراچی۔ اور مراکز علمیہ مثل دارالرشاد (پیر جھنڈا) مظہر العلوم (کراچی)، دارالعلوم دیوبند میں جمعیۃ خدام الحکمۃ کے مراکز ہوں گے۔

(۳) دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) کے مرکز میں جمعیۃ خدام الحکمۃ کی صدارت جناب پیر صاحب العلم دامت برکاتہم اور مظہر العلوم (محلہ کھڈا) میں اس شعبہ کی صدارت جناب مہتمم صاحب زید مجدھم اور دارالعلوم دیوبند میں جناب مہتمم صاحب زید مجدھم کریں گے۔

(ز) اس جمعیۃ خدام الحکمۃ کے محل اور مقام کو بیت الحکمۃ کہا جائے گا۔

(ح) بیت الحکمۃ میں قرآن عظیم کی حکیمانہ تفسیر پڑھائی جائے گی۔

(ط) بیت الحکمۃ میں فقط امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی تعلیم ہو سکتی ہے۔

(ی) بیت الحکمۃ میں ایسا کتب خانہ جمع کیا جائے گا۔ جس کی مدد سے امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کا حکماء ہند اور حکماء یورپ سے مقابلہ کیا جاسکے"۔

بیت الحکمت کے قیام کا اصل مقصد:

تقریباً ۲۵ سال کی جلاوطنی کی زندگی گزار کر اور روس اور ترکی کے انقلابات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت امام جب وطن لوٹے تھے تو انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یورپ سے الحاد اور بے دینی کا جو سیلاب آ رہا ہے اگر ہندوستان کے عوام کو اور خصوصاً مسلمانوں کو اس سے بچانے کی بروقت کوشش نہ کی گئی تو یہ پورے ملک کو اور مسلمانوں کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔ اس کے ساتھ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اگر ہندوستان نے صنعت میں یورپ کی شاگردی اختیار نہ کی اور یورپ کے انقلابات اور سیاسیات سے سبق نہ سیکھا تو وہ ترقی کے دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ حضرت امام ایک طرف تو یورپ کی صنعت گری کے قائل تھے اور دوسری طرف لادینی اور الحاد کے سخت مخالف تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر وہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی مذہبیت اور مسلمانوں کے دین کو اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف وحدت الوجود کا فلسفہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی حکمت ہے۔ چنانچہ انہوں نے حکمت ولی اللہی کی تعلیم و اشاعت کے لیے بیت الحکمت یا محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل اسکولوں کی بنیاد رکھی۔

بیت الحکمت میں کیا پڑھایا اور کیا سکھایا جائے گا۔؟ اس کی تفصیل حضرت امام کے اپنے قلم سے اوپر گزر چکی ہے۔ بیت الحکمت کے نصاب میں شاہ ولی اللہ کی کتابوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں بھی ایک ترتیب ہے، (الف) قرآنی علوم میں کتابیں، (ب) اسلام کی فلاسفی میں حجۃ اللہ البالغہ جس کے ساتھ الموطا اور اس کی ولی اللہی شروح المسوی اور المصفی شامل ہیں اور (ج) تصوف کی بعض کتب۔ اول درجہ میں تمام

کتب شاہ ولی اللہ کے علوم و معارف کی ہیں، دوسرے درجہ میں امام عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ اسماعیل شہید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی بعض تصنیفات جو شاہ ولی اللہ کی کتابوں کو سمجھنے کے لیے شروح کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت امام عبید اللہ سندھی کا خیال تھا کہ اگر کوئی نوجوان اس کورس کو مکمل کرلے تو وہ کبھی بے دین، ملحد اور خدا کا منکر نہیں ہو سکتا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اگر غیر مسلم نوجوان بھی پڑھنا چاہیں گے تو وہ ان کے مطالعے میں ان کی پوری طرح مدد کریں گے۔ حضرت امام سندھی کو پختہ یقین تھا کہ بیت الحکمت سے فارغ ہو کر جو علماء نکلیں گے وہ نہ صرف مذہب میں راسخ العقیدہ ہوں گے بلکہ دین کے متبحر عالم اور اسلامی فلاسفی کے ماہر ہوں گے، بلکہ ملکی اور بین الاقوامی سیاسیات میں بھی وہ اپنی نظر و بصیرت کے آپ مالک ہوں گے۔ وہ سیاسی افکار میں اور اپنے فیصلوں میں کسی مفکر اور مدبر کے نہ محتاج ہوں گے، نہ رہین منت۔ بیت الحکمت کے طلبہ کو نہ صرف سیاسی تعلیم دی جائے گی اور فلسفہ سیاسیات پڑھایا جائے گا بلکہ انہیں سیاسی تربیت بھی دی جائے گی، جس کے بعد بیت الحکمت کے فارغ التحصیل اسمبلیاں بنانے، عوام کی ہمہ جہت خدمت کرنے اور ملک کو چلانے کے قابل ہو جائیں گے۔

جمعیت طلباء سندھ کے اجلاس میں صدارتی تقریر:

اس سلسلے میں حضرت امام سندھی کی وہ تقریر بہت اہمیت رکھتی ہے، جو انہوں نے ۱۷۔ اپریل ۱۹۴۴ء کو حیدر آباد (سندھ) میں جمعیت طلباء سندھ کے اجلاس میں کی تھی۔ اس تقریر میں مولانا سندھی نے کئی اہم باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں "توحید" کے قارئین کے مطالعے کے لیے اس کی خاص خاص باتوں کو پیش کیا جاتا ہے (۵)۔ آپ نے فرمایا۔

۱۔ کسی عارف باللہ سے تعلق:

"میں سولہ برس کا تھا اور اردو میں میٹرک کے درجہ تک تعلیم پا چکا تھا کہ میں مسلمان ہوا۔ مجھے کلمۂ توحید حضرت حافظ صاحب محمد صدیق قدس سرہ بھرچونڈی والوں نے پڑھایا۔ حضرت میرے لیے ماں باپ کی بجا تھے۔ اور ماں باپ کی طرح وہ میرے مربی بنے۔ ان کی دعا کی تاثیر سے میں اپنے اندر بڑی برکتیں محسوس کرتا ہوں۔ میں نے کتنی ہی غلطیاں کی ہوں گی۔ لیکن حضرت حافظ صاحب کی دعا کی برکت سے مجھے خدا تعالیٰ نے ان کے شر سے بچا لیا۔ میں اپنے آپ کو حضرت صاحب کی جماعت کا ایک فقیر سمجھتا ہوں"۔

خطبے کے آغاز ہی میں ایک عارف کامل کا تذکرہ اور اس سے اپنی نسبت کے اظہار کا میں یہ مطلب سمجھتا ہوں کہ کسی مقرب بارگاہ الٰہی سے تعلق پیدا کرنے کے بعد صبر و استقامت اور ایثار کا وہ جوہر پیدا ہوتا ہے، جو مقاصد میں کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے اور وقت کے کسی صاحب فقر سے تعلق ارادت کے بعد خدا شناسی کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے، جس کے بعد ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اگر انسان خدا شناسی کے اس مقام کو نہ پا سکے تو پھر وہ ہمیشہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔

۲۔ ولی اللہی نصاب تعلیم کی اہمیت:

بھرچونڈی شریف کے بزرگ سے سلوک و طریقت میں اپنی نسبت کے بیان کے بعد مولانا سندھی نے ضروری سمجھا کہ علمی سلسلہ نسب بھی بیان کر دیا جائے۔ تاکہ طریقت اور شریعت و علم دین کی تحصیل کی دونوں نسبتیں لوگوں کے علم میں آ جائیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

"میرا علمی تعلق بنیادی طور پر حضرت مولانا شیخ الہند سے ہے

۔ میرے استاد، مولانا محمد قاسم قدس سرہ کے شاگردوں میں ایک
خاص مرتبے کے مالک تھے۔ میں اپنے استاد کا یہ مرتبہ پہچانتا ہوں۔
اور میری کوشش یہ ہے کہ حضرت کے اس مرتبہ کو زندہ رکھوں
۔ ان کو حضرت مولانا محمد قاسم کے واسطہ سے جو علم بطور وراثت
کے امام ولی اللہ قدس سرہ کو ملا تھا۔ خدا کے فضل سے مجھے اس
کی بہت کچھ سمجھ حاصل ہے۔ میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ یہ
علم ہندوستان کے مسلمانوں میں بالعموم اور دہلی اور جہاں جہاں اردو
بولی جاتی ہے اور صوبہ سندھ میں خاص طور پر محفوظ ہو جائے"۔

حضرت امام قدس سرہ کا مطلب یہ ہے کہ مغلیہ دور والے دہلی کے علوم کی ہر حالت میں حفاظت کی جائے اور شاہ ولی اللہ، یا مولانا محمد قاسم کی کتابیں اسی وقت سمجھ میں آئیں گی جب دہلی والا نصاب محفوظ رہے گا۔ خود اگرچہ قرآن شریف اور فلسفہ اسلام کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں پڑھاتے تھے، لیکن اسی تقریر میں وہ ایک جگہ فرماتے ہیں

"ہم عربی طلبہ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے انہیں
دیوبند کا نصاب مکمل کرنا چاہیے۔ وہ اس نصاب کے عقلیات کے
حصے کو بھی ویسا ہی پڑھیں، جیسا دینی حصہ کو پڑھتے ہیں۔"

حضرت امام سندھی نے اس کا فائدہ یہ بتایا ہے۔

"اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ وہ امام ولی اللہ کی حکمت کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔"

۳۔ انقلاب کی بنیادی فکر .... عقیدہ توحید:

اسی خطبہ حیدر آباد (سندھ) میں حضرت امام سندھی فرماتے ہیں:

"قرآن شریف کی تعلیمات کی اصل اصول یعنی اس مسئلہ

توحید کو صحیح طرح سمجھنے میں مولانا شاہ اسماعیل شہید کی کتاب "تقویت الایمان" نے میری رہنمائی کی تھی۔ چنانچہ میں حضرت مولانا شہید کو شروع ہی سے اپنا ہادی اور مرشد مانتا آیا ہوں بعد میں جب میں نے مسئلہ توحید کے متعلق اپنا مطالعہ بڑھایا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس توحید کے مسئلہ کے ضمن میں مسلمانوں میں وہابی اور غیر وہابی کا جھگڑا بڑے زوروں پر چل رہا ہے۔ مجھے مسلمانوں کا یہ اختلاف پسند نہ آیا۔ اور اس کا حل آخر میں نے یہ ڈھونڈا کہ میں قادری طریقے کا ایک فقیر ہوں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی کتاب "فتوح الغیب" کو مانتا ہوں۔ اس میں توحید کا مفصل بیان ہے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اس کتاب کو وہابیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اب اگر میں توحید کو سمجھانے کے لیے فتوح الغیب کو اپنے لیے مرکزی اور اساسی کتاب بناتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ سندھ سے مسئلہ توحید کے ضمن میں وہابیت کا سوال گم ہو جاوے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے اس طرز فکر سے سندھ کی پوری سرزمین سے یہ ناگوار بحث ختم ہو گئی لیکن اتنا تو ضرور ہوا کہ میرے ساتھیوں اور میرے ساتھ کام کرنے والوں میں وہابی اور غیر وہابی جھگڑا زور نہ پکڑ سکا۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی کتاب "فتوح الغیب کو بڑی محبت سے پڑھتا ہوں۔ اور مولانا محمد اسماعیل شہید کی کتاب تقویت الایمان کو اس کا ترجمہ سمجھتا ہوں۔"

حضرت قطب العارفین حافظ محمد صدیق، بھرچونڈی والے راشدیہ قادری سلسلے کے مرشد و امام تھے اور فتوح الغیب کی تعلیم کی وجہ سے اس جماعت میں سنت کا اتباع اور

بدعت سے انکار شروع ہی سے چلا آ رہا تھا۔ حضرت امام سندھی نے اپنے ابتدائی طالب علمی کے زمانے ہی میں اسلام کے اظہار سے قبل شاہ اسماعیل شہید کی تقویت الایمان کو پڑھ کر توحید و شرک کا مسئلہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ پھر جب اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر حضرت شاہ شہید کو ہندوستان میں وہابی مشہور کیا گیا تھا یہ دیکھ کر حضرت امام سندھی نے تقویت الایمان کی بجائے فتوح الغیب موئلفہ سیدنا عبدالقادر جیلانی کو دوستوں کے سامنے پیش کیا۔ اس میں بھی توحید کا وہی سبق اور بدعت سے اسی طرح بیزاری تھی جو تقویت الایمان کی خصوصیت تھی۔ اس طرح حضرت مولانا سندھی اور ان کے معتقدین مخالفین کے اٹھائے ہوئے فتنے کے اثرات سے اور وہابیت کے الزام سے بچ گئے۔

۴۔ دارالرشاد کا قیام:

> "توحید اور جہاد۔ یہ دو چیزیں تھیں جن پر ہم طلبہ کو تعلیم دیتے وقت خاص زور دیتے تھے۔ توحید اور جہاد کی اس طرح تعلیم دینا ہر مسجد اور ہر مدرسہ میں ممکن نہ تھا۔ امروٹ ضلع سکھر میں حضرت مولانا تاج محمود رحمتہ اللہ علیہ ہمارے لیے مثل باپ کے تھے۔ چنانچہ ہم وہاں آرام و اطمینان سے حسب منشا تعلیم دیتے رہے۔ امروٹ میں کچھ عرصہ پڑھانے کے بعد حضرت شیخ الہند نے اپنے کام میں ہمارا درجہ بڑھا دیا۔ اور آپ نے ہمیں سندھ میں کام کرنے کا اور طریقہ بھی سمجھایا۔ ہم نے ان کے حسب ارشاد کام شروع کر دیا۔ اور کسی سے اس کا ذکر تک نہ کیا کہ ہم یہ کام حضرت شیخ الہند کا بتایا ہوا کر رہے ہیں۔ بظاہر ہم اس کام کو اپنے نام سے کر رہے تھے۔ میرے مشفق بزرگ حضرت صاحب امروٹی

کو میرا اس طرح کام کرنا پسند نہ آیا۔ چنانچہ ہم مجبور ہو گئے کہ امروٹ کی بجائے گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد سندھ میں دارالرشاد کے نام سے ایک مدرسہ بنائیں۔ ہمیں اس مدرسہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے میں پورا اختیار تھا اور پیر صاحب گوٹھ پیر جھنڈا کا ہمارے ساتھ فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہ ہمارے کام میں بالکل دخل نہ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عہد کو سچے دل سے نبھایا"۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ نے حضرت مولانا سندھی سے ارشاد فرمایا تھا کہ سندھ میں دارالعلوم دیوبند کے نصاب کو رائج کر کے ولی اللہی خاندان سے اس کا تعارف کرائیں۔ مولانا سندھی نے اس کے لیے امروٹ شریف میں مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن حضرت امروٹی نے اسے پسند نہیں کیا۔ وہ (شاید) انہیں اپنا گدی نشین بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے درس و تدریس کے بجائے ذکر و شغل میں ان کی رہنمائی اور دوسرے انداز سے ان کی تربیت ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن حضرت امام سندھی کی انقلابی فطرت سے یہ باتیں میل نہ کھاتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے اس ماحول سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک نیا میدان عمل منتخب کر چکے تھے۔ اس لیے امروٹ شریف سے اٹھے تو گوٹھ پیر جھنڈا میں حضرت پیر سید ابو تراب رشد اللہ شاہ راشدی صاحب العلم کی اجازت سے دارالرشاد کی بنیاد رکھ دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرکز کی اس تبدیلی میں ان کے استاد حضرت شیخ الہند کا مشورہ و ایما شامل تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ میں دیوبندی نہ صرف وہابی کہلاتے جاتے تھے، بلکہ یہاں کے مولوی صاحبان انہیں کافر کہتے تھے۔ سندھ میں ولی اللہی تحریک و فلسفہ کے فروغ و اشاعت میں یہ بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ پہلے ایک مدرسہ قائم کر کے ہم فکر علماء پیدا کیے جائیں اس کے بعد ہی آئندہ سیاسی یا مذہبی کام کی نشو و فروغ ممکن تھا۔ حضرت مولانا قدس سرہ اس مقصد میں ایسے کامیاب ہوتے کہ آج

سندھ میں دیو بندی فکر کے مدارس کا ایک جال پھیل گیا ہے اور ان سے قومی وملی بہترین کارکن اور مذہبی وسیاسی رہنما سب سے زیادہ تعداد میں سندھ کو میسر آئے ہیں۔

۵۔ انقلاب کیسے لایا جائے:

مولانا سندھی نے علمی اور انقلابی جہاد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

"سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند کا یہ انقلاب کیسے عمل میں لایا جائے؟ میرا کہنا یہ ہے کہ اس کے لیے ہمیں یورپ سے سیکھنا ضروری ہے۔ ہمارے پرانے ہتھیار اس زمانے میں کسی کام کے نہیں رہے۔ کمال پاشا اور امان اللہ خان اس بات کو خوب سمجھ گئے تھے اور ہم بھی باہر رہ کر اس حقیقت کو اچھی طرح جان گئے ہیں۔ یورپ کی سائنس اور یورپ کے حربی فنون ہمیں یورپ سے سیکھنے ہوں گے، لیکن ہماری انقلابی جماعت کا پروگرام امام ولی اللہ کے فکر پر مبنی ہو گا۔ جب ہم اپنے اہل ملک کو کہتے ہیں کہ "یورپین بنو" تو ہمارے اس کہنے کا دراصل یہی مطلب ہوتا ہے"۔

۶۔ یورپین علوم اور ٹیکنالوجی کا حصول اور برٹش کامن ویلتھ میں شرکت

بعض حضرات مولانا سندھی مرحوم پر سوچے سمجھے اور فکر و تدبر کے بغیر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو یورپین بننے کی ترغیب دے کر انہیں ان کی تہذیب و معاشرت سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے حضرت امام سندھی کا مدعا سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ حالانکہ حضرت مولانا کا مقصد یہ ہے کہ ایک مسلمان یا کوئی ہندوستانی ولی اللہی فلسفہ کے مطابق پکا خدا پرست اور راسخ العقیدہ مسلمان رہ کر بھی ملک کی ترقی کے لیے وہ تمام اعمال انجام دے سکتا ہے۔ جو ترکی جیسی مملکت نے جدید سائنس،

ٹیکنالوجی اور فوجی تنظیم میں اختیار کر کے اپنے استقلال و استحکام کے لیے انجام دیے ہیں۔ حضرت امام سندھی اس کی مزید تشریح کرتے ہوتے فرماتے ہیں:

"جب یہ تسلیم کر لیا کہ ہمارے لیے یورپ سے سائنس اور فنون کا حاصل کرنا ضروری ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں کو ہم انگریزوں سے بطریق احسن سیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے میری رائے میں مناسب اور موزوں یہ ہے کہ ہم انگریزی بولنے والی اقوام کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کریں۔ اس میں ہمارا فائدہ ہے اور مصلحت بھی اس امر کی مقتضی ہے۔ اس کو میں "برٹش کامن ویلتھ" کے اندر رہنا کہتا ہوں۔ ہم سندھ کو ڈومینن اسٹیٹ بناتے ہیں اور برٹش کامن ویلتھ کے اندر رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں میری اپنی ہے۔ میرے استاد کی بتائی ہوئی نہیں۔ لیکن پچھلی جنگ میں ترکی کی شکست اور مسلمانوں کے بین الاقوامی مرکز ٹوٹنے کے بعد انہوں نے آئندہ کے بارے میں کچھ ارشادات فرمائے تھے، جن سے اس قسم کا مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

ڈومینین اسٹیٹس کا حصول:

ایک دفعہ ایک مجلس میں دوران گفتگو مولانا سندھی مرحوم نے فرمایا کہ ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس یا آزادی مل جاتے تو یہ ایک بڑی بات ہوگی۔ اور بلاشبہ یہ ضرور ہو گا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اس کے لئے کوئی تیاری نہیں کر رہے ہیں۔ ہندو تجارت اور ٹیکنالوجی میں یورپین بن چکا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔ یہی وقت ہے کہ اسے بھی کچھ کرتا ہوا نظر آنا چاہیے۔ ورنہ آئندہ وہ ترقی کی دوڑ میں بہت

پیچھے رہ جائے گا۔

۷۔ سندھ میں ہاری اور زمیندار کا تعلق:

مولانا سندھی نے اسی پیش نظر خطبے میں ہاری (کسان) اور زمیندار کے مسئلے پر بھی نہایت فکرانگیز بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ایک اور بات جو گو ایک زائد چیز ہے ہم اس موقعہ پر کہے دیتے ہیں۔ اس جلسہ میں بعض دوستوں نے کسان اور زمیندار کا ذکر چھیڑا ہے ہم بھی کسان کے طرفدار ہیں۔ ہم کسانوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں، ان کی سیاسی تربیت کرنا چاہتے ہیں، انہیں اس قابل بنانا چاہتے ہیں۔ کہ وہ اسمبلی میں نمائندہ بن کر بیٹھ سکیں۔ ہم کسان کے لیے سب کچھ چاہتے ہیں، لیکن ہم اس کو زمیندار سے ٹکراتے اور لڑاتے نہیں۔ ہمارے ملک میں زمیندار کا آج ایک درجہ ہے۔ وہ زمین کا لگان کسانوں سے وصول کر کے حکومت کو پہنچاتا ہے۔ جب ہم حکومت سے نہیں لڑتے تو کسان کو اپنے زمیندار سے کیوں لڑائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کس طرح اسمبلی میں جا کر زمینداروں سے کسانوں کے حقوق لیے جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری خاص بات ہے اور اسی لیے ہم اپنی ایک مستقل سیاسی پارٹی بناتے ہیں۔ ہم کسان کے حقوق سے دست بردار ہونے والے نہیں، مگر بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں روس سے آئی ہوئی ایک تحریک چل رہی ہے۔ اس تحریک میں کام کرنے والے کامریڈ کسان کو زمیندار سے لڑانا چاہتے ہیں۔ ہم بھی چونکہ روس سے ہو کر آتے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے بعض لوگوں کا خیال ہو کہ ہم بھی کسان کو

زمیندار سے لڑانے کے داعی ہوں گے۔ ہمارے متعلق یہ سمجھنا ٹھیک نہیں"۔

اسی سلسلے میں مولانا سندھی نے ایک دفعہ بڑی حکیمانہ بات فرمائی۔ ایک بڑے زمیندار کو مخاطب کر کے فرمایا کہ سندھ کا زمیندار ہی مسلمانوں میں کچھ بہتر حالت میں ہے، اگر اس کے ساتھ ہاری (کسان) کو لڑوایا گیا تو مسلمانوں کی ایک بڑی طاقت فنا ہو جائے گی۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کے خیال میں ہاری اور زمیندار کو ایک ہی پارٹی میں لایا جائے۔ زمیندار ہاریوں کی جماعت کا سیکرٹری بن کر کام کرے، ہاریوں کے بچوں کو پڑھائے۔ ان کی صحت کا خیال رکھے، ان کی حق تلفی نہ کرے۔ اس طرح ہی دونوں فریق ترقی بھی کریں گے اور روسی انقلاب کے تباہ کن اثرات سے بھی بچ جائیں گے۔

۸۔ دیہات میں کام کرنے کی ضرورت:

جمعیت طلبہ سندھ کے اجلاس میں پیش کیے جانے والے اس خطبے میں مولانا سندھی مرحوم نے ایک اور اہم بات پر روشنی ڈالی آپ نے زور دیتے ہوئے فرمایا:

" آخر میں ہم ایک بات پر زور دیتے ہیں۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ سندھ کی شہری آبادی کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ مگر باہر اطراف اور دیہات میں مسلمانوں کے اشراف خاندان اب تک موجود ہیں۔ ان میں اچھے پیر ہیں۔ اچھے زمیندار ہیں اور نیک علماء بھی ہیں۔ ان لوگوں کے بڑے بڑے خاندان ہیں۔ جن کی گزر زمینداری پر ہے۔ ان میں دینی علوم کی اشاعت کا بڑا میدان ہے۔ ان کو انگریزی زبان سے واقف کرانا بھی اشد ضروری ہے۔ اگر ہماری نوجوان طلبہ ہمت کر کے یہ کام اپنے کاندھوں پر اٹھالیں تو وہ سندھ میں اسلامیت کو نئی زندگی بخش

سکتے ہیں"۔

حقیقت میں سندھ کے معنی ہی "دیہات" کے ہیں۔ یعنی دیہات کے لوگ کماتے ہیں اور شہری کھاتے ہیں۔ یہ ایک نظام ہے جس میں دیہات کو ایک محوری حیثیت حاصل ہے اور شہران کے محتاج ہیں۔ لیکن دیہات کے باشندے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اپنی اہمیت اور قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں۔ اسی وجہ سے وہ شہری آبادی سے مرعوب اور دبے ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ان میں حضرت استاد سندھی کے ارشاد کے مطابق دینی و دنیاوی تعلیم پھیل جائے تو وہ سارے سندھ پر حکومت کر سکتے ہیں۔ دیہات کی اہمیت کے حوالے سے ایک مرتبہ حضرت امام سندھی نے فرمایا کہ انبالہ ضلع کے سکھوں کے ایک گروہ نے جو کافی عرصہ امریکہ میں رہ کر وطن واپس آیا ہے نواحی گاؤں کو یورپین انداز میں تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ماڈل گاؤں بناتے ہیں، جن میں راستے ہیں، ہر دو تین گاؤں کے لیے ایک اسکول اور ایک ہسپتال قائم کیا ہے۔ ڈائمنڈ موٹر (جنریٹر) کے ذریعے گھر گھر برقی روشنی پہنچائی ہے اور جدید مشینوں کے ذریعے کاشت کاری، کھیلوں کے لیے میدان اور تفریح کے لیے چھوٹے چھوٹے باغیچے بناتے ہیں"۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ سندھ کے دیہات بھی اسی طرح ترقی کرتے ہوئے نظر آئیں"۔

اہل سندھ سے ایک گزارش:

سندھ کے مسلمانوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے اس بے مثال فلسفی، حکیم علم اور انقلابی مفکر کے حکیمانہ اقوال کو مد نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھیں، وقت کے تقاضوں کو سمجھیں اور قومی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لیں۔ ہمیں یقین ہے کہ سندھ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے حضرت امام مولانا عبید اللہ کے بتائے ہوئے طریقے اور پروگرام کے سوا کوئی دوسری راہ عمل نہیں ہے۔ اگر سندھ کے مسلمان اس انقلابی

مفکر اور استادِ وقت کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹے اور اس پر چلنے سے روگردانی کی تو وہ ہمیشہ کے لیے حیرانی اور سرگردانی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس انجام سے مسلمانوں کو اپنی پناہ میں رکھے۔

(توحید۔ کراچی، اکتوبر ۱۹۴۴ء)

مولانا عبید اللہ سندھی کی زندگی

آخری چار مہینے

حضرت امام سندھی رحمتہ اللہ علیہ دہلی جاتے تھے تو عام طور پر بیمار ہو کر واپس آتے تھے۔ اس دفعہ اپریل ۱۹۴۴ میں جمعیت طلباء سندھ کے اجلاس کی صدارت اور جمعیت علمائے سندھ کے اجلاس میں شرکت کے بعد حیدر آباد (سندھ) پہنچے تو آپ کے ٹھہرنے کا انتظام تاج محل ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ مولوی ظہیر الحق صاحب دین پور شریف سے آپ کے ساتھ آتے تھے۔ حیدر آباد میں طالب علم مولوی عبدالمجید آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ دست اور پیچش کی بیماری نے کافی شدت اختیار کر لی تھی۔ میں نے حضرت امام کی یہ حالت دیکھی تو آپ کی اجازت کے بغیر اپنے محترم دوست حکیم شمس الدین کو بلا لیا۔ انہوں نے حضرت کا معائنہ کیا۔ نسخہ تجویز کیا اور اپنے مطب سے دوائیں بھی بھجوا دیں۔

حضرت امام اپنی بیماری کے بارے میں کبھی خود کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع نہیں کرتے تھے۔ البتہ اگر کوئی دوست کسی ڈاکٹر یا حکیم کو لے آتا تھا تو اس سے مشورے سے گریز اور انکار بھی نہ کرتے تھے۔ آپ علاج معالجے کے قائل نہیں تھے اس لیے لگ کر کبھی پرہیز نہیں کرتے تھے۔ حیدر آباد میں چار دن کے قیام کے دوران میں شیخ عبدالمجید صاحب نے اپنے ایک دوست ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے بھی علاج کروایا، لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا اور حالت تقریباً وہی رہی۔ اس دوران میں ایک چیز جس کا ہمیں تجربہ ہوا، یہ تھی کہ جب آپ ہوٹل کے کمرے میں ہوتے تھے تو اجابت کے لیے بار بار اٹھنا پڑتا تھا، لیکن جب جمعیت کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے تو مسلسل کئی کئی گھنٹوں

تک کسی تکلیف کے اظہار کے بغیر بیٹھے رہتے تھے یا کمزوری کے سبب سے تکیے کے سہارے لیٹ جاتے تھے۔ ان کی قوت ارادی اتنی زیادہ تھی کہ بڑی سے بڑی تکلیف سے توجہ ہٹا سکتے تھے۔

گزشتہ سال ایک دفعہ ملاقات میں میں نے امام سندھی سے دریافت کیا کہ آیا تصوف کے لطائف میں ان کے طریقوں کا شغل بھی ضروری ہے؟ آپ نے فرمایا:

"ہاں! ایک انقلابی کے لیے تو بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ اس سے قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ انقلاب کی راہ میں بہت مشکلات پیش آتی ہیں اور تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں۔ اگر انقلابی میں قوت برداشت کی کمی ہو تو وہ گھبرا جائے گا، جس سے انقلاب کے عمل کو نقصان پہنچے گا۔ مرشد طریقت کی صحبت اور تعلیم کی بہ دولت سب سے بڑی جو چیز حاصل ہوتی ہے، وہ قوت ارادی اور تسلیم و رضا کا مقام ہے، جہاں پہنچ کر آدمی میں سب کچھ جھیل جانے اور برداشت کر لینے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زبان سے اف تک نہیں کرتا"۔

مزید فرمایا کہ

"سلوک کے تمام راستے میرے دیکھے بھالے ہیں۔ مگر آخری حد تک پہنچنے کے بعد میں نے یہ راستہ ترک کر دیا میرے مرشدوں کا ارادہ تھا کہ اشغال طریقت کی تکمیل کے بعد وہ مجھے خرقہ خلافت سے سرفراز کریں گے، لیکن میری طبیعت کو سلوک و طریقت سے ایسی مناسبت نہ تھی۔ میرے سامنے دوسرے کاموں کی اہمیت تھی۔ میرا ذوق سراسر سیاسی عملی تھا۔ گویا مجھے پیدا ہی اس کام کے لیے کیا گیا تھا"۔

حیدر آباد' کا اجلاس ختم ہونے کے بعد مولانا قاری محمد طیب صاحب صدر جمعیت علماء (اجلاس حیدر آباد سندھ) کو حضرت مولانا عبید اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے مشورے سے دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) تشریف لے چلنے کی دعوت دی گئی، جو انہوں نے منظور فرمالی۔ حضرت امام سندھی بھی اسی بیماری کی حالت میں موٹر کے ذریعے حیدر آباد سے دارالرشاد پہنچے۔ وہاں سے قاری طیب صاحب تو خان بہادر حاجی مولا بخش خان کی دعوت پر شکار پور چلے گئے اور آپ وہیں ٹھہر گئے۔ میں حیدر آباد ہی سے کراچی آ گیا تھا۔ کچھ عرصہ گزرا تھا کہ دارالرشاد سے مولانا عزیز احمد صاحب کا خط ملا کہ حضرت امام سخت بیماری کے باوجود شکار پور میں مدرسہ دارالسعادت گورو پھوڑ کے معائنے کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ میں کراچی سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جب سکھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت امروٹ شریف میں ہیں اور مجھے بار بار یاد کر رہے ہیں کہ ان سے آ کر مل جاؤں۔

جون کی ابتدائی تاریخوں میں حضرت امام شکار پور تشریف لے گئے اور خان بہادر مولا بخش سے ۱۵ منٹ ملاقات کی۔ بیماری نے انہیں لاغر کر دیا تھا اور مسلسل تکلیف میں تھے، لیکن جب کہیں جانے کا عزم کر لیتے تھے تو کمزوری اور تکلیف کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔

۹۔ جمادی الثانی (۱۳۶۳ھ / یکم جون ۱۹۴۴ء) جمعرات کے دن دوپہر کے وقت فرمایا کہ یہاں سے سیدھے بھرچونڈی شریف چلنا ہے۔ سخت گرمی اور حبس کا عالم تھا۔ جب آپ کو بتایا گیا کہ سکھر جانے والی بس نکل چکی ہے اور ریل کے ذریعے جائیں تو ریل دوسرے روز صبح کو پہنچے گی۔ آپ نے فرمایا کہ ۱۰۔ جمادی الثانی کو جمعے کے دن حضرت مرشد سید العارفین حافظ محمد صدیقؒ کی برسی ہے اور اس میں شرکت ضرور کرنی ہے۔ اگر شام کو ۶ بجے روہڑی سے ریل پر سوار ہو جائیں تو رات ہی کو بھرچونڈی شریف پہنچ جائیں گے۔ حضرت امام کے اصرار کو دیکھ کر میں شکار پور سے سکھر کے لیے

کرایے کے تانگے کی تلاش میں نکلا تو معلوم ہوا کہ سکھر جانے والی بس ابھی روانہ نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ ہم حضرت مولانا کو لے کر ۲ بجے بس سے روانہ ہوتے اور ۴ بجے سکھر پہنچ گئے اور اسی وقت گھوڑا گاڑی کے ذریعے روہڑی جا پہنچے۔ بس کے تکلیف دہ سفر اور گرمی کی شدت سے حضرت امام نڈھال ہو گئے تھے لیکن تکلیف کا اظہار بالکل نہیں کیا۔

روہڑی اسٹیشن پر میر ہزار خان انسپکٹر ریلوے پولیس موجود تھا۔ وہ حضرت امام کے شیدائیوں اور عاشقوں میں سے تھے۔ انہوں نے سفر کے لیے مناسب انتظام کر دیا اور ہم بہت آرام کے ساتھ مغرب کا وقت ہونے والا تھا کہ ڈھرکی اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

حضرت امام تکلیف اور ضعف کے باوجود ریل یا گھوڑا گاڑی وغیرہ میں چڑھتے یا اترتے وقت کسی کا سہارا قبول نہیں فرماتے تھے۔ اگر کوئی سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تھا تو اس کا ہاتھ جھٹک دیتے تھے۔ ڈھرکی اسٹیشن پر ریل سے اتر کر باہر آتے، میں نے درگاہ (بھرچونڈی شریف) کے لیے بگھی کرایے پر لی۔ مغرب کی نماز کے وقت بھرچونڈی پہنچ گئے۔ جب تک آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست ہوتا، آپ زمین پر بیٹھ گئے اور وہیں پر مغرب کی نماز ادا کی۔

ڈھرکی سے درگاہ کی مسافت زیادہ نہیں۔ اس دوران میں آپ کوئی وظیفہ یا آیات کریمہ پڑھتے رہے۔ درگاہ پہنچ کر بگھی والے کو کرایہ دینے سے مجھے روک دیا اور خود ایک روپے کے بجائے تین روپے دیے۔ مرشد کی درگاہ پہنچ کر حضرت کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی تھی اور ایک رونق آ گئی تھی۔ اس وقت آپ پر ایک عجیب وارفتگی کی کیفیت طاری تھی اور ذوق نیاز اور عقیدت کمال درجے پر پہنچ گیا تھا۔ بھرچونڈی شریف میں حضرت امام سندھی نے دو رات اور ڈیڑھ دن قیام فرمایا۔ اس دوران میں بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ حضرت سجادہ نشین صاحب دو دفعہ آپ کی مزاج پرسی

کے لیے آپ کی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ میں تو حضرت کے ساتھ ہی تھا، مولوی عبدالمجید طالب علم بھی آپ کی خدمت کے لیے بھرچونڈی شریف پہنچ گیا تھا۔ ایک دفعہ اس سے کہا کہ

"مراقبے کے وقت تو سامنے نہ آیا کر۔ اس لیے کہ تصور شیخ کے بعد دل نہیں چاہتا کہ آنکھیں کھولوں تو کسی غیر آدمی پر نظر پڑے"۔

صوفیہ کرام میں "شغل برزخ" ایک مقام ہے، جس میں حضرت مولانا آخری وقت تک غرق رہتے تھے۔ (اگرچہ ہم اہل حدیث ان چیزوں کے قائل نہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار کی گنجائش بھی نہیں)۔

ایک دفعہ حضرت نے فرمایا کہ درگاہ بھرچونڈی شریف کی مسجد کی تعمیر کے وقت یہ لازم قرار دیا گیا تھا جو لوگ اس کے لیے اینٹیں بنائیں، ڈھوئیں، بچھائیں اور چنیں وہ باوضو رہیں اور لا الہ الا اللہ کے ورد سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسجد میں نماز پڑھنے کا ایک خاص لطف اور مزا ہے۔

ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے اور غور سے جماعت کو دیکھ کر واپس تشریف لے آئے۔ مسجد کے ساتھ جنوب میں ایک گنبد کے نیچے آپ کے مرشد کامل حضرت سید العارفین حافظ محمد صدیق کا مقبرہ ہے، لیکن آپ مقبرہ میں نہیں گئے۔ اگرچہ حضرت امام سے وجہ پوچھنے کی جرات نہیں ہوئی لیکن شاید یہ وجہ ہو گی کہ جب "شغل برزخ" جاری تھا تو مقبرے پر جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

۱۱۔ جمادی الثانی ۱۳۶۳ھ / ۳ جون ۱۹۴۴ء بروز ہفتہ دن ڈھلے (سہ پہر کو) ہم بھرچونڈی شریف سے روانہ ہوئے۔ حضرت سجادہ نشین نے اپنی بگھی عطا کی جس کے ذریعے ہم آرام سے ڈھرکی پہنچ گئے۔ چوں کہ گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی اس لیے اسٹیشن کے پاس پیر صاحب کا جو بنگلہ اور مسجد ہے، اس میں گاڑی کے آنے تک

آرام اور انتظار کیا۔

حضرت امام سندھی نے فرمایا "میں ۲۰۔ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ (۳۱۔ جنوری ۱۸۹۱ء) میں دیوبند سے فارغ ہو کر جب ڈھرکی اسٹیشن پر پہنچا تو رات تھی۔ بھرچونڈی جانے کے لیے صبح کا انتظار کیا۔ یہاں ایک شخص نے کہا کہ جنگل اور ویرانے میں ایک دیا جل رہا تھا، افسوس وہ بجھ گیا۔ اشارہ حضرت قطب العارفین کی وفات کی طرف تھا۔"

حضرت امام نے مزید فرمایا:

"سردیوں کی یہ سخت رات ایک قلی کی کوٹھری میں گزری۔ رات بھر آنسو بند نہ ہوئے۔ صبح کے وقت درگاہ پہنچا۔ مسجد کے باہر اس درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا جہاں طلب علم کے سفر پر روانگی کے وقت حضرت مرشد سید العارفین نے آکر رخصت کیا تھا۔ میرے اوپر رقت طاری تھی۔ لوگ مجھے درگاہ کے اندر لے گئے۔ سجادہ نشین صاحب اور سب نے مجھے دلاسا دیا صبر کی تلقین فرمائی۔ میری یہ کیفیت تھی کہ مسلسل دو روز و شب تک میری ہچکی بند نہ ہوئی۔ حضرت خلیفہ صاحب مولانا غلام محمد دین پوری جو وہاں موجود تھے، تمام وقت میری دل جوئی اور دلداری فرماتے رہے۔ تیسرے دن یہ کیفیت ختم ہوئی"۔

آپ نے مزید فرمایا:

"اس وقت میرا ارادہ بھرچونڈی شریف میں کچھ دیر ٹھہرنے کا تھا، لیکن میاں صاحب نے سجادہ نشین پیر میاں عبداللہ صاحبؒ (حضرت حافظ صاحب قدس سرہ کے بھتیجے) نے مقبرے کی تعمیر کا ارادہ کر لیا۔ جماعت کے کچھ علماء اس سے متفق نہ تھے۔ میری بھی یہی رائے تھی کہ مقبرہ تعمیر نہ کیا جائے

۔اس لیے یہاں سے دور رہنا ہی مناسب سمجھا"۔

حضرت مولانا سندھی نے فرمایا:

"سجادہ نشین میاں صاحب میرے بڑے خیر خواہ تھے۔ وہ ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے اور میری بات مانتے بھی تھے"۔

[لیکن معلوم ہوتا ہے یہ بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو وہ مقبرے کی تعمیر کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس معاملے میں انہوں نے حضرت کے خلفاء اور علمائے کرام کی بات بھی درخور اعتنا نہ سمجھی تھی۔ (ا۔س)]

اس موقع پر حضرت امام نے مزید فرمایا:

"میں بھرچونڈی شریف سے طلب علم کے لیے نکلا تھا تو حضرت مرشد حافظ صاحب نے فرمایا تھا۔ خدا کرے عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے۔"

مولانا فرماتے تھے:

"میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی خدمت میں پہنچا دیا"۔

حضرت امام سندھی نے فرمایا:

"میرا ارادہ تھا کہ کان پور میں مولانا محمد حسن منطقی کان پوری کی خدمت میں تحصیل علم کروں گا۔ مگر سہارن پور پہنچا تو کسی نے کہا اگر پڑھنے جا رہے ہو تو دیکھو یہاں قریب کے قصبہ دیو بند میں بھی ایک مدرسہ ہے اسے بھی دیکھتے جاؤ۔ شاید یہاں تمہارے لیے علم مقدر ہو۔ میرے دل پر اس بات کا اثر ہوا۔ کان

پور جانے کا ارادہ ترک کیا اور دیو بند پہنچ گیا۔ حضرت شیخ الہند
مولانا محمود حسن کی شاگردی اور آپ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا۔
یہ سب کچھ حضرت مرشد سید العارفین کی دعا کی برکت تھی"۔

ڈھرکی سے ہم رات کو سکھر پہنچے اور دوسرے دن کراچی آ گئے۔ اسٹیشن پر اتر کر حضرت امام نے مجھے رخصت کیا اور خود بگھی میں سوار ہو کر مظہر العلوم (محلہ کھڈا) روانہ ہو گئے۔ (ماہنامہ توحید کراچی۔ اکتوبر ۱۹۴۴)

(۲)

کراچی میں حضرت امام ڈاکٹر عبدالعزیز کے زیر علاج رہے اور یہاں آپ کی حالت درست ہونے لگی۔ مولانا سندھی روزانہ بگھی میں سوار ہو کر نیاز مند (وفائی) کے گھر پر میمن گاڑی کھاتہ میں تشریف لے آتے تھے۔ وہاں سے ہم صدر میں ڈاکٹر صاحب کے پاس جاتے تھے۔ ڈاکٹر آپ کا بہت معتقد اور مخلص دوست تھا۔ وہ بہت توجہ سے آپ کا علاج کرتا تھا اور دوا دارو میں کوئی کمی نہ چھوڑتا تھا۔

حضرت مولانا محمد صادق صاحب (کھڈے والے) بھی بہت اخلاص کے ساتھ آپ کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ مسٹر محمد امین خان کھوسو ایم ایل اے کا اخلاص و عقیدت اور خدمت گزاریاں بھی ایسی نہیں جنھیں بھلا دیا جائے۔ حضرت امام کبھی کبھی خود بھی ان کے پاس رائل ہوٹل میں تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت ان کو "میرا خان" کہہ کر مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے فرمایا:

"سندھ کی کمیونسٹ پارٹی کے محمد امین خان لیڈر ہیں۔ وہ
بہت سمجھ دار ہیں اگر انہیں کوئی بات سمجھا دی جائے تو وہ اپنے
دوستوں کو بہ آسانی اپنا ہم خیال بنا سکتے ہیں"۔

رجب (۱۳۵۳ھ / جولائی ۱۹۴۴ء) کے مہینے میں جمعیت علماء سندھ کی مجلس منتظمہ

کا اجلاس ہونے والا تھا۔ حضرت امام نے فرمایا :

"اس اجلاس میں ضرور شرکت کرنی ہے"۔

چنانچہ ہم حیدر آباد گئے ۔ وہاں شیخ عبدالمجید بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ مولانا تاج محل ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ جمعیت کے اجلاسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ بعض موقعوں پر آپ نے کچھ مشورے بھی دیے۔

مولوی عبدالکریم بھی جو کہ روسی عالم علامہ موسیٰ جار اللہ کے ساتھیوں میں سے ہیں، اس موقعے پر حیدر آباد آتے تھے۔ انہوں نے مکہ شریف میں حضرت امام نے قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تھا۔ وہ امام کے خصوصی شاگردوں میں سے ہیں۔ انہیں حضرت نے ایک مجلس میں تنبیہ کرتے ہوتے فرمایا کہ اگر سندھ میں رہ کر کام کرنے کا ارادہ ہے تو پھر دیہات سے کام کا آغاز کرو۔ دیہات میں لوگوں کو تعلیم دینے اور دین سکھانے کی سخت ضرورت ہے۔ کسی جماعت میں پھنس کر نہ رہ جائیں۔ کیوں کہ ان (جماعتوں) سے دیہات والوں کو فائدہ پہنچنے کی کوئی امید نہیں۔

حیدر آباد سے حضرت نے میرپور خاص جانے کا ارادہ کیا۔ فرمایا :

"وہاں مولوی عبداللہ صاحب لغاری کی والدہ ہیں، میں انہیں ماں کہتا ہوں۔ انہیں دیکھنا چاہتا ہوں"۔

چنانچہ ہم میرپور خاص گئے۔

یہ خاتون (مولوی عبداللہ لغاری کی والدہ) حضرت قطب العارفین حافظ صاحب بھرچونڈی شریف سے بیعت تھیں وہ کئی سال تک حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں اذکار و اشغال میں مصروف رہی تھیں۔ گزشتہ مہینے ذوالقعدہ (۱۳۶۳ھ / اکتوبر۔ نومبر ۱۹۴۴ء) میں ان خاتون نے ۱۱۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

میرپور خاص میں حضرت مولانا مولوی عبداللہ کے مکان پر تین دن مقیم رہے۔ میں نے اپنے دوست وڈیرہ فقیر محمد خان منگریو کے ساتھ قیام کرنا مناسب خیال کیا۔ البتہ

صبح شام روزانہ حضرت کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ یہاں حضرت امام کو مولوی عبدالقادر صاحب مہتمم مدرسہ دارالرشاد کا انتظار تھا۔ انہیں سانگھڑ سے آنا تھا۔ ان کے آ جانے کے بعد ہم مولوی عبداللہ لغاری کو اور انہیں ساتھ لے کر نواب شاہ کے لیے روانہ ہوئے۔ نواب شاہ سے گوٹھ پیر جھنڈا جانے کا ارادہ تھا۔

میرپور خاص میں قیام کے دوران میں میرے دوست وڈیرہ فقیر محمد خان نے بہت خدمت کی۔ خان بہادر غلام محمد خان نے بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ میرپور خاص سے نواب شاہ تک کا سفر خرچ ہم سب کا وڈیرہ فقیر محمد خاں منگریو نے برداشت کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ نواب شاہ میں حکیم محمد معاذ صاحب کے پاس رات کو قیام کیا۔ دوسرے روز دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) کے لیے روانہ ہوئے۔ پیر جھنڈا پہنچ کر سب سے پہلے حضرت امام نے سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ کے لیے زمین کا جو ٹکڑا جناب پیر سید ضیاء الدین شاہ صاحب نے بہ طور عطیہ دیا تھا، اس سلسلے میں پیر صاحب موصوف سے مل کر بعض معاملات طے فرمائے اور اطمینان ہو گیا کہ زمین حضرت امام کی تحریک کے لیے ہمیشہ کے لئے مل گئی۔

دارالرشاد میں حضرت امام کے ایک شاگرد مولوی بشیر احمد صاحب بی اے لدھیانوی قیام پذیر تھے۔ حضرت امام نے ان سے سورہ مزمل اور سورہ مدثر کی تفسیر سنی جو کہ وہ کتابی صورت میں کتاب الانقلاب کے نام سے مرتب کر کے لاتے تھے۔ مولوی بشیر احمد نے حضرت امام کی خدمت میں پیش کی اور تصحیح کروائی۔ اس وقت تک شاید یہ کتاب لاہور میں چھپ کر شائع بھی ہو گئی ہو۔

دوسرے روز کراچی چلنے کے لیے روانہ ہونا تھا۔ صبح کے وقت حضرت امام نے قرآن شریف کا درس دیا۔ آیات وہ زیر درس آئیں جن میں مکہ شریف کو قرآنی انقلاب کا مرکز بنانے کا ذکر تھا۔ قرآن شریف پر یہ آپ کی آخری تقریر تھی اور اتنی دلچسپ، فکر انگیز، عالمانہ اور بلند پایہ تقریر تھی کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف

ذوق سماعت سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس کہ ہم اسے یاد نہیں رکھ سکے۔ لیکن میں نے دیکھا تھا کہ مولوی بشیر احمد لدھیانوی اس کو قلم بند کر رہے تھے۔

یہ سفر ہم نے بارہ دن میں ختم کیا تھا۔ کراچی سے ہم نے اس سفر کا آغاز کیا تھا اور بارھویں دن ہم کراچی واپس پہنچ گئے۔ کراچی سے روانہ ہوتے تھے تو حضرت امام کی طبیعت قدرے بہتر تھی، لیکن مسلسل سفر اور بے آرامی کی وجہ سے طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ کراچی آکر کچھ وقت تو ڈاکٹر خان کے زیر علاج رہے۔ پھر کراچی کے مشہور معالج ڈاکٹر احمد سعید کا علاج شروع ہوا۔ وہ مظہر العلوم محلہ کھڈا میں حضرت مولانا کو دیکھنے خود تشریف لے آتے تھے۔ بیماری کی حالت میں مولانا پرہیز بہت کم کرتے تھے۔ اگرچہ مولانا کے کھانے کا باقاعدہ انتظام تھا لیکن مسٹر محمد امین خان کھوسو یورپین طرز کی ہلکی غذا بھیجتے رہتے تھے۔

جب بیماری نے زیادہ زور پکڑا تو مسٹر محمد امین خان کھوسو اور شیخ عبدالمجید صاحب نے آنریبل ڈاکٹر ہیمن داس وزیر سے آپ کا معائنہ کرایا۔ ان کا مشورہ تھا کہ مولانا کو یورپین طرز کے کسی نرسنگ ہوم میں رکھا جائے۔ حضرت امام نے پہلے تو اس مشورے پر عمل کے لیے آمادگی ظاہر کی، لیکن بعد میں انکار کر دیا۔ اس دوران میں مسٹر جی ایم سید نے اپنے بنگلے پر ٹھہرنے کی گزارش کی، لیکن آپ نے اس کو قبول نہیں کیا۔

شعبان کے آخری ہفتے میں مجھے یاد فرمایا اور پیر جھنڈا چلنے کی تیاری کرنے کا حکم دیا۔ گاڑی رات کو گیارہ بجے جاتی تھی لیکن آپ صبح دس بجے سے تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ میں آپ کی خدمت میں ۲ بجے حاضر ہوا مسٹر محمد امین خان کھوسو نے فرسٹ کلاس میں سیٹ ریزرو کرا دی۔ خان بہادر میر غلام علی تالپور نے اور مسٹر عبدالمجید عباس چیف آفیسر حیدر آباد کو حکم دیا کہ وہ حیدر آباد اسٹیشن پر صبح موٹر لے کر پہنچ جائیں۔ اس موقعے پر مولانا غلام مصطفی فاضل دیوبند، مولانا عزیز اللہ شہداد کوٹی، مولوی عبدالواحد سندھی (دہلوی)، پروفیسر محمد سرور (جامعہ ملیہ، دہلی) آپ کی مزاج پرسی اور دیکھنے کے

لیے کراچی آتے ہوتے تھے۔ حضرت امام نے مجھ سے فرمایا کہ اس سفر میں میرے ساتھ تم ہی اکیلے چلو گے۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اس لمبے سفر میں اکیلے آدمی کے لیے ایک بیمار کو سنبھالنا اور تیمار داری کے فرائض ادا کرنا مشکل ہو گا۔ اس لیے میں نے مولانا عزیز اللہ شہداد کوٹی کو ساتھ چلنے کے لیے اشارہ کر دیا۔ رات کو کراچی اسٹیشن پر حضرت مولانا محمد صادق صاحب شیخ عبدالمجید صاحب اور مسٹر محمد امین کھوسو موجود تھے۔ ان سب نے مولانا کو الوداع کیا۔ صبح کو حیدر آباد پہنچے۔ اسٹیشن پر مسٹر عبدالمجید صاحب موٹر لیے ہوتے موجود تھے۔ پیر علی محمد راشدی بھی اسٹیشن پر آ گئے تھے۔ انہوں نے موٹر پر سوار ہوتے وقت حضرت امام کا آخری فوٹو کھینچا۔ حیدر آباد سے موٹر کے ذریعے روانگی ہوئی۔ مسٹر عبدالمجید بھی ساتھ ہو لیے تاکہ بہ حیثیت چیف آفیسر راستے میں کوئی ضرورت پیش آئے تو مددگار ثابت ہوں۔

حیدر آباد سے گوٹھ پیر جھنڈا پچاس میل کی مسافت پر ہے۔ پراونشل روڈ ہونے کی وجہ سے راستہ بالکل صاف تھا۔ اس لیے سعید آباد پہنچنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس دوران میں مولانا عزیز اللہ صاحب (شہداد کوٹی) نے جو خدمت انجام دی وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس اخلاص و محبت اور بے غرضانہ خدمت کا اجر عطا فرمائے۔

راستے میں حضرت امام نے ایک جگہ فرمایا۔ مجھے شاہ لطیف کے شعر سناؤ "مسٹر عباس اور مولانا عزیز اللہ نے کچھ اشعار (ڈوھڑے) سنائے۔ باتوں کے دوران میں دہلی اور اردو زبان کا ذکر آیا تو آپ نے مرزا داغ دہلوی کی ایک غزل سنائی۔ لیکن ضعف کی وجہ سے آواز بہت آہستہ تھی اس لیے غزل پوری طرح سمجھ میں نہ آئی۔ ایک مصرع یاد رہ گیا، جو اس طرح تھا۔

تصویر یار اپنی جبیں پر بنائیں گے

ہم تقریباً ۱۲ بجے دوپہر کو دارالرشاد کے دروازے پر پہنچ گئے۔ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش کے لیے مدرسہ کی اوپر کی منزل پر ایک خاص کمرے میں انتظام کیا

گیا تھا۔ جہاں مولانا عزیز اللہ صاحب رات دن آپ کی تیمارداری اور خدمت گزاری میں مصروف رہتے تھے۔ کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ حکیم، ڈاکٹر وغیرہ آتے لیکن سب مایوس نظر آتے تھے۔ دوسرے روز حضرت امام کے نواسے میاں ظہیر الحق اپنے چند دوستوں کے ساتھ دارالرشاد پہنچے۔ میں حضرت امام کی خدمت میں برابر حاضر رہتا تھا۔ ایک دن آپ نے مجھے بلایا اور ارشاد فرمایا۔

"تمہارے بچے کراچی میں ہیں۔ رمضان شریف کا مہینہ قریب آگیا ہے۔ اس لیے تمہیں جانے کی اجازت ہے"۔

حضرت امام کی اجازت سے میں کراچی آگیا۔ ۲۹۔ شعبان کو حضرت بھی دین پور شریف کے لیے روانہ ہو گئے۔ جہاں ۲۔ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ کو پورے ہوش و حواس میں بولتے چالتے صبح کے وقت مالک حقیقی سے جا ملے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

معلوم ہوا کہ مولوی احمد علی صاحب لاہوری حضرت امام کے آخری وقت میں آپ سے ملاقات کے لیے دین پور تشریف لائے تھے۔ انہیں آپ نے کچھ وصیت بھی فرمائی تھی۔ مگر بعد میں انہوں نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ حضرت امام کی تحریک کا سب سے بڑا مخالف ہی انہیں سمجھا جاتا ہے۔ افسوس! انا للہ و انا الیہ راجعون

(ماہنامہ توحید۔ کراچی۔ نومبر دسمبر ۱۹۴۴ء)

ترجمہ: پروفیسر سید منور علی۔ گورنمنٹ ڈگری سائنس اینڈ کامرس کالج۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی۔

تحریک بیت الحکمت

خدمات کا ایک پہلو

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے پروگرام کے مطابق پچھلے مہینے کراچی میں بیت الحکمت کا ادارہ عملاً قائم کر دیا گیا۔ اس میں امام ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات اور اسلامی فلاسفی پڑھائی جائے گی۔ اس سلسلے میں "خدام الحکمت" کی طرف سے ایک اپیل شائع کی گئی تھی۔ اس کے جواب میں جن حضرات نے سبقت بالخیرات کا مقام حاصل کیا وہ راشدی خاندان کی شاخ جھنڈے والے بزرگ تھے۔ یہ علم و اشرف کا ایک قدیم گھرانا ہے۔ امت مسلمہ میں اس کے روحانی فیضان اور علم و عمل میں اہل سندھ پر اس خاندان کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا۔ آج سندھ میں جو بڑے بڑے علماء اور اصحاب درس و افتا ہیں وہ سب دار الرشاد (پیر جھنڈا) کے شاگرد اور فارغ التحصیل ہیں۔ اگرچہ آج وہاں پہلے جیسا ہنگامہ درس و تدریس، ہجوم تلامذہ و شائقین علم اور رجوع عام و خاص نہیں، لیکن وہ اپنی تاریخ کی قدامت، علم و عمل کے میدانوں میں عظیم الشان خدمات، شریعت و طریقت میں اپنی فیض رسانی اور دعوت و ارشاد کے ایک اہم تاریخی مرکز ہونے کی حیثیت سے سندھ کی دینی اور سیاسی تاریخ میں سربلند و ارجمند ہے۔

سندھ کے اس مرکز انقلاب اور راشدی سلسلے کے اس خاندان سعادت سے مولانا عبید اللہ سندھی کے خاص تعلقات تھے۔ مولانا کے دل میں اس کی بہت قدر تھی۔ مولانا نے اس کا اعتراف کیا ہے اور وہ آخری دم تک اس کا لحاظ فرماتے رہے۔ مولانا سندھی کی وفات کے بعد ان کی دعوت کا یہ خاندان سب سے بڑا پشت پناہ تھا۔ اب بھی اس خاندان علم و اشرف نے مولانا کی علمی اور اسلامی تحریک میں امداد اور تعاون میں سب سے پہلے قدم اٹھانے کا عزم کیا۔

خاکسار مدیر توحید (دین محمد وفائی) اور مولانا محمد نور صاحب مکی کراچی سے گوٹھ پیر جھنڈا کے لیے ۱۴ ۔ دسمبر (۱۹۴۸ء) کو روانہ ہوئے۔ حیدر آباد سے سکرنڈ اور مورو کی طرف جانے والی بس میں سوار ہوئے اور تقریباً ۴ بجے دارالرشاد (پیر جھنڈا) پہنچ گئے۔ سب سے پہلے دارالرشاد کے صدر مدرس مولوی عبید اللہ (فاضل دیو بند) سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ان کے ہم نام مولوی عبید اللہ صاحب جالندھری مہتمم کتب خانہ سے ملے۔ وہ بھی دیو بند اور ڈابھیل کے فاضل ہیں۔ اسی روز عصر کی نماز سے پہلے سجادہ نشین پیر حاجی ضیاء الدین شاہ صاحب کی زیارت اور ملاقات کا شرف حاصل کر کے روحانی مسرت سے مالا مال ہوئے۔

جناب پیر حاجی محمد مہدی شاہ صاحب جن کی دعوت پر یہ سفر اختیار کیا تھا، وہ اس وقت درگاہ میں موجود نہیں تھے اس لیے میں جناب صاحبزادہ وحب اللہ شاہ صاحب کا مہمان ہو گیا۔ میں پورے سات دن دارالرشاد میں مقیم رہا۔ اس دوران میں پیر محمد مہدی شاہ صاحب بھی تشریف لے آئے تھے۔ بیت الحکمت کی امداد کے کام کا سلسلہ انہی پیر صاحب کی آمد پر موقوف تھا۔ انہوں نے اپنی ہمت سے اس سلسلے میں جو کچھ کر دکھایا۔ اس کا دل پر خاص اثر ہے۔

بیت الحکمت کے سلسلے میں جو اپیل کی گئی ہے۔ وہ دو قسم کی رکنیت کے لیے ہے۔

۱۔ ایک سو روپے سالانہ دینے والے۔

۲۔ سال بھر میں صرف دس روپے دینے والے۔

پیر جھنڈے کے ہمارے بزرگوں نے پہلی قسم کے رکن بن کر ہماری ہمت افزائی کی اور اسلامی خدمت کے لیے اپنا دست کرم دراز کیا۔ چنانچہ۔

۱۔ حضرت پیر سید مولانا حاجی ضیاء الدین شاہ صاحب العلم الخامس

۲۔ پیر سید حاجی محمد مہدی شاہ صاحب (صاحب العلم کے برادر)

۳۔ صاحبزادہ پیر سید صدر الدین شاہ صاحب (صاحب العلم کے برادر زادہ)

۴۔ صاحبزادہ پیر سید وحب اللہ شاہ ابن صاحب العلم الخامس

نے ایک ایک سو روپے عنایت فرمائے۔ ان کے سوا صاحبزادہ حکیم فضل حق ابن صاحب العلم الخامس نے دوسرے قسم کا رکن بننا قبول فرمایا۔ الحمد للہ و جزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

جس انداز سے اس علمی اور روحانی خاندان کے ارکان رفیع الشان نے بیت الحکمت کی امداد کی ابتداء کی اس سے یقین کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو ضرور کامیابی سے ہم کنار کرے گا۔

کتب خانہ:

گوٹھ پیر جھنڈے میں قیام کے دوران میں مولانا محمد نور مکی اور میں نے زیادہ وقت کتب خانے میں گزارا۔ حضرت پیر مولانا حاجی ابو تراب رشد اللہ شاہ صاحب العلم الرابع ایک بڑے علمی ذوق کے بزرگ تھے، جنہوں نے ہزاروں کی تعداد میں نایاب کتب جمع کی تھیں۔ ان کے زمانے میں حیدر آباد دکن، عظیم آباد پٹنہ، لکھنؤ وغیرہ کے علما شائقین علم حضرت کی لائبریری دیکھنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ کتنے ہی نوادر علمی جو مصر، استنبول اور حجاز کے کتب خانوں میں موجود نہ ہوں گے، مگر اس کتب خانے میں مل جائیں گے۔ حدیث کی کتنی ہی کتابیں جیسے مستدرک امام حاکم، سنن بیہقی، جمع الفوائد کے مخطوطات اس کتب خانے سے لے کر چھپوائے گئے ہیں۔

ہمارے مولانا محمد نور مکی کو ایک کتاب "ناظورۃ الحق" یہاں ملی جس کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ یہ کتاب انہیں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں بھی نہیں ملی تھی جو یہاں ہاتھ آ گئی۔

بڑے پیر سائیں (صاحب العلم الرابع) کی وفات کے بعد بھائیوں کے اختلاف کی وجہ

ے کتب خانے کو بہت نقصان پہنچا، کتنی ہی نایاب کتابیں ادھر ادھر ہو گئیں۔ اس سے کتب خانہ اگرچہ بہت حد تک تباہ اور ناقص ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود نایاب کتابوں کا اب بھی یہاں اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ خاص طور پر سندھ کے علماء مخدومین کی تصنیفات اس طرح کہیں ایک جگہ نہیں مل سکتیں جو کہ اس نادر اور عظیم الشان لائبریری میں موجود ہیں۔

حضرت پیر سائیں ابو تراب رشد اللہؒ (چوتھے جھنڈے والے) نے مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کا کتب خانہ خرید لیا تھا جس میں کتنی ہی نایاب کتب ہاتھ لگی تھیں۔ ان میں بیشتر کتابیں غیر مجلد تھیں، ان کے ورق منتشر ہو گئے اور سیکڑوں کتابیں ناقص ہو گئیں۔ اس وقت اگرچہ ان متفرق و منتشر اوراق کی جمع و ترتیب کا کام ہو رہا ہے، لیکن یہ اتنا بڑا کام ہے کہ مہینوں تو کیا سالہا سال کی محنت اور توجہ کا طالب ہے جب کہیں جا کر یہ پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔

شاہ عبدالکریم بلڑی والے کے ملفوظات "بیان العارفین" (فارسی) ایک نایاب شے ہے۔ اس کا نسخہ بھی منتشر و متفرق اوراق کے اسی ڈھیر میں دستیاب ہوا۔ اسی طرح "ینابیع الحیوۃ المدیتہ" مصنفہ شیخ ابو الحسن ڈاہری کا ایک نسخہ بھی ورقوں کے اسی ڈھیر میں ہاتھ لگا۔ اسی طرح اگر تلاش جاری رہی تو امید ہے کہ کتنے ہی نایاب و نادر کتابوں کے ناقص یا کامل نسخے ہاتھ لگیں گے۔

موجودہ سجادہ نشین پیر صاحب جناب مولانا ضیاء الدین شاہ کے چھوٹے بھائی پیر احسان اللہ شاہ صاحب کے الگ ہونے کے بعد سے ان کا مدرسہ اور کتب خانہ الگ قائم ہے۔ ان بزرگ کا تو انتقال ہو گیا ہے اب ان کے فرزند پیر مولوی حاجی حافظ سید محب اللہ شاہ صاحب ان کی جگہ سجادہ نشین ہیں۔ یہ صاحب اعلیٰ علمی ذوق اور بڑی فضیلت کے مالک ہیں۔ ہم دونوں ان صاحب کی ملاقات کے لیے گئے جو ایک دن قبل ہی حرمین شریفین کے سفر سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنے نادر کتب خانے کی سیر

کرائی۔ چونکہ وقت تنگ تھا اور اسی رات کراچی کے سفر کی تیاری کرنی تھی۔ اس لیے ان بزرگ کی کتابوں کا دیدار دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھا۔ آئندہ سفر میں ان شاء اللہ ان کی کتابیں دیکھنے کی آرزو پوری کریں گے۔

سعید آباد اور ہالا:

دوسرے دن (۲۱ دسمبر کو) گوٹھ پیر جھنڈے سے رخصت ہو کر ہم سعید آباد پہنچے۔ جہاں مولوی حکیم قاضی لعل محمد دارالرشاد کے فارغ التحصیل ایک عالم اور محدث ہیں، ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ دس روپے دے کر تحریک بیت الحکمت میں شریک ہوئے۔ یہیں کا ایک نیک بخت نوجوان میاں محمد ہارون آبدار ہے۔ وہ بھی بیت الحکمت کا رکن بنا۔ یہاں سے ریل میں سوار ہوئے اور پانچ بجے ہالا پہنچے۔ چونکہ مولانا محمد نور کمی کو کراچی جلد پہنچنا تھا۔ اس لیے وہ ہالا سے حیدر آباد جانے والی بس میں سوار ہوئے اور مجھے ان سے جدا ہونا پڑا۔

میرا ارادہ تھا کہ اپنے عزیز دوست سید بچل شاہ مختار کار ہالا کا مہمان بنوں گا اور رات ان کے ساتھ گزاروں گا، لیکن ان کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ دورے پر گئے ہوئے ہیں اس لیے یہ رات اپنے پرانے دوستوں حاجی پیرو محمد انصاری اور حاجی ملن علی محمد انصاری کے اوطاق میں بسر کی۔ دوسرے روز (۲۲۔ دسمبر کی) صبح کو شاہ صاحب بھی ہالا پہنچ گئے اور جوں ہی انہیں ہالا میں میری موجودگی کا علم ہوا مہربانی فرمائی اور اپنا پٹے والا بھیج کر مجھے بلوالیا اور اپنا مہمان بنایا۔ سائیں بچل شاہ سے تعلق خاطر اور ان کی کن نوازشوں کا ذکر کیا جائے۔ ان کے اوصاف اور رسمی شکریے کی بالکل ضرورت نہیں، وہ اس سے بہت بلند ہیں۔ ان کا اور میرا معاملہ من توشدم تو من شدی کی مثال ہے۔ ان کے اور میرے درمیان سے غیریت کا پردہ اٹھ گیا ہے۔

مخدوم پیر غلام حیدر:

ہالا میں حضرت مخدوم مولانا پیر غلام حیدر صاحب ایم ایل اے کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ دو گھنٹے تک حضرت مخدوم سائیں سے ملاقات ہوئی اور ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوا۔ وہ تھے، ان کی خاص مجلس تھی اور علم و تصوف کی دلچسپ حکایتیں تھیں جن کی لذت قلب اب تک محسوس کر رہا ہے۔ ان کی شیریں کلامی ابھی تک کانوں میں رس گھول رہی ہے۔

ہالا کے احباب گویا پہلے ہی بیت الحکمت کی تحریک میں حصہ لینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ چنانچہ سات حضرات نے دس دس روپے کی فوراً رسیدیں حاصل کر لیں اور ایک صاحب نے یکمشت پچاس روپے دے کر اپنے ذوق اور قوت ایمانی کا ثبوت دیا۔ ہالا ہی میں ہمارے قدیمی مخلص مسٹر عبدالرحمن آر۔ بی ڈپٹی کلکٹر کی رہائش گاہ تھی۔ ان کی مہربانیوں کا کیا بیان کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں کچھ وقت ان کی میزبانی کا لطف اٹھاؤں۔ لیکن مجھے کراچی پہنچنے کی جلدی تھی، اس لیے ان سے معذرت کرنی پڑی۔

حیدر آباد:

۲۲۔ دسمبر کی شام کو میں ہالا سے روانہ ہوا اور محترم سائیں بچل شاہ ازراہ کرم مجھے حیدر آباد تک چھوڑنے آئے تاکہ راستے میں مجھے کوئی تکلیف نہ ہو۔ حیدر آباد میں ہم حاجی خدا بخش کنبان جاگیردار کے اوطاق میں ٹھہر کر شاہ صاحب تو ۲۳۔ دسمبر کی صبح کو ہالا روانہ ہوئے اور میں کوئٹہ میل سے کراچی کی طرف روانہ ہوا۔

مولانا عبید اللہ و مولانا محمد نور مکی:

اس سفر کی روداد اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک دارالرشاد کے صدر مدرس اور وہاں کی لائبریری کے مہتمم کی مہربانیوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان صاحبوں

نے ہماری تواضع اور خاطرداری کے لیے وہ سب کیا جس کی سندھ کی تہذیب اور روایات کے مطابق ایک اچھے سندھی میزبان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں عالم سردی کے اس موسم میں فجر کی نماز کے لیے گرم پانی اور صبح ۶ بجے چائے کا اہتمام نہایت مستعدی سے فرماتے رہے۔ شب کی علمی مجالس بھی ایسی نہیں جنہیں فراموش کیا جا سکے۔ ان مجالس میں ایک طرف مولانا محمد نور مکی ہوتے تھے جو کھلے ذہن کے ساتھ آزادانہ انداز میں اسلامی فکر پیش کرتے تھے۔ دوسری طرف مولانا عبید اللہ جالندھری ہوتے تھے جو خالص مولویانہ انداز میں ان پر معترض رہتے تھے۔ اس مباحثے کی بدولت وقت کے کتنے ہی مسائل پر نئی روشنی پڑتی تھی اور نئے پہلو سامنے آتے تھے۔ موجودہ دور میں ایسی علمی مجلسیں کبھی کبھی میسر آتی ہیں۔ اس لیے کہ موجودہ دور میں دنیاوی مسائل اتنے گھمبیر اور معاملات ایسے الجھ گئے ہیں کہ دین کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ لوگ دین سے منہ موڑ رہے ہیں اور دین ایک بھولی بسری کہانی بنتا جا رہا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ماشاء اللہ تعالیٰ۔ لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

(توحید، کراچی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء)

مولانا عبید اللہ سندھی

شخصیت اور ارشادات

دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) میں طالب علمی کے جو دن گزارے تھے، وہ کیا ہی خوب اور کیسی بے فکری کے دن تھے۔ ایک طرف دیہات کی سادہ زندگی، جو کیف و لذت سے بھرپور تھی اور دوسری طرف حضرت مولانا امام عبید اللہ سندھی کی علمی صحبتوں کا عالم ہی نرالا تھا۔ وہ پر کیف ایام اور علمی صحبتوں کا مزا ایسا نہیں، جو دل سے فراموش ہو جائے۔

مئی (۱۹۴۲ء) کی ۲۵۔ تاریخ کو دارالرشاد سے سکھر جانے کے ارادے سے روانہ ہوا لیکن کتابیں، کپڑے اور دوسرا سامان وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ اس لیے کہ جن باتوں کو سمجھنے اور حضرت امام سندھی سے علمی استفادے کے جس مقصد سے میں نے دارالرشاد کا یہ سفر اختیار کیا تھا وہ مقصد ابھی پورا نہیں ہوا۔ میں جلد ہی وہاں پھر جاؤں گا، وہاں قیام کروں گا اور حضرت امام سندھی کے چشمہ علوم و معارف سے اپنی تشنگی کو دور کروں گا اور جن علوم کو سیکھنے کی دل میں آرزو ہے اسے پورا کروں گا۔

عام طور پر لوگ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کو ایک سیاسی رہنما اور انقلابی کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ان کی بے انتہا علمی وسعتوں اور تصوف و معرفت میں ان کے

مقام کی بلندیوں سے بالکل نا آشنا ہیں۔ حضرت مولانا کے علمی مقام کے بارے میں مولوی محمد نور مکی نے مجھے بتایا کہ مولانا مدظلہ ۱۲ برس مکہ میں مقیم رہے۔ اس عرصے میں سیکڑوں علما۔ شرق و غرب حرم شریف میں آتے رہے، مگر میں غور کرتا رہا کہ مولانا سندھی کے علمی مرتبے کا بھی کوئی عالم نظر آئے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ مولوی محمد نور صاحب نے مزید فرمایا کہ مصر کے بہت بڑے عالم و مفسر علامہ طنطاوی جوہری نے سفر حج کے موقعے پر ایک مرتبہ حضرت مولانا سے مکہ میں ملاقات فرمائی اور قرآن حکیم کے بعض مطالب پر گفتگو ہوئی۔ حضرت مولانا نے علامہ کو ان کی مشہور تفسیر میں ان کی بعض تاویلات کی طرف توجہ دلائی جس کو انہوں نے قبول کیا۔

مکہ شریف کا بڑا عالم شیخ عبدالرزاق آل حمزہ اور دوسرے بڑے علما بھی سالہا سال تک قرآن اور حدیث کا درس لینے کے لیے حضرت مولانا سندھی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور طریقہ شاہ ولی اللہ پر اپنے شبہات حل کراتے رہے۔

اتنے وسیع علم، نہایت فضل و کمال، سیاست میں اس قدر بلند مقام اور اپنے گرد و پیش میں بے شمار عقیدت مندوں اور جان نثاروں کے باوجود، حضرت مولانا ایسے بے نفس صوفی اور درویش تھے کہ کسی سے ادنی خدمت بھی نہ لیتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر انہیں پانی پینا ہوتا یا وضو کے لیے کوزہ بھرنا ہوتا تو خود ہی اٹھ کر پانی پیتے تھے اور خود ہی اپنا کوزہ بھرتے تھے۔ اس کے لیے کسی شاگرد یا معتقد کو زحمت نہ دیتے تھے۔

مولانا نے یورپ میں سلطنتوں کے انقلابات دیکھے ہیں۔ بڑی بڑی سلطنتوں کے چلانے والوں کو انہوں نے مشورے دیے ہیں۔ انہوں نے افغانستان کو انقلاب سے گزرتے، محکومی سے آزادی حاصل کرتے اور پھر استعمار کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہوتے دیکھا۔ روس میں جو ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد پڑی اور ترکی کو ایک عہد سے نکلتے اور جدید جمہوریہ کے دور میں داخل ہوتے اور اس کی عظمت کی نئی بنیادیں پڑتے دیکھا۔ حجاز پہنچے تو وہ ایک عہد انقلاب سے گزر رہا تھا اور وہاں کی انقلابی حکومت حجاز کی

نئی تعمیر کے سر و سامان میں مصروف تھی۔ انہوں نے کھلی آنکھوں سے ان تمام انقلابات و تغیرات کو دیکھا تھا۔ ان کے سامنے ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور وہ ہر لمحہ اس پر عمل پیرا اور اس کی تکمیل کے مساعی میں مصروف رہے۔ انہوں نے وطن کی آزادی کے لیے بنیادی کردار ادا کیا اور مستقبل کی تعمیر کا سر و سامان کر دیا اور شب و روز اسی فکر میں ہیں۔ لیکن افسوس کہ سندھ میں ان کے بلند مقام اور ان کی عظیم الشان خدمات کو جاننے والا کوئی نہیں۔ مولانا جیسی شخصیت اگر کسی زندہ قوم میں ہوتی تو وہ قوم ان کے اشاروں پر اپنی جانیں چھڑکتی اور اپنا سب کچھ قربان کر دینا اپنا فرض سمجھتی۔

دارالرشاد کے متصل مولانا مدظلہ نے بیت الحکمت کے قیام کے لیے ایک قطعہ زمین خریدا ہے۔ اب اس کی عمارت کی تعمیر کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ افکار و خیالات کی اشاعت اور تحریک شروع کرنے کے لیے بھی مرکز کی ضرورت ہے، لیکن مولانا بہت کم سوال بزرگ ہیں۔ وہ کسی کے سامنے دست سوال پھیلانا بالکل پسند نہیں کرتے۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ حضرت مولانا کے اس کام کے لیے جو دراصل قوم کی تعمیر کا کام ہے، اپنے کچھ احباب کو توجہ دلاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت مولانا اور ان کے منصوبے کے تعارف کے بعد کوئی اہل دل دولت مند ایسا نہ ہو گا جو اپنے دست جود و سخا کو روک لے۔

اہل سندھ کو شاید پتا نہیں کہ لاہور میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک گروہ تیار ہو گیا ہے کہ وہ فلسفہ شاہ ولی اللہ کی تصانیف کو انگریزی زبان میں شائع کرے۔ اس کے لیے وہ حضرت مولانا سندھی سے بار بار استدعا کرتے ہیں کہ مولانا کچھ عرصہ لاہور میں قیام فرمائیں اور فلسفہ و حکمت ولی اللہی انہیں پڑھائیں۔ دہلی میں جامعہ ملیہ کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین نے حضرت مولانا سے درخواست کی ہے کہ وہ جامعہ ملیہ میں قیام فرمائیں اور وہاں کے اساتذہ و طلبہ کو اپنے خیالات اور علوم سے بہرہ ور فرمائیں۔ لیکن مولانا مدظلہ کو چوں کہ سندھ سے خاص تعلق خاطر ہے اور اس سرزمین سے عشق ہے، اس لیے وہ اس

سرزمین کو سب پر مقدم سمجھتے ہیں، یہاں کے عوام کی خدمت کو ترجیح دیتے ہیں اور مدرسہ دارالرشاد کو اس کام کے آغاز کے لیے مناسب سمجھتے ہیں اور سندھ کو پورے ملک کے لیے وہ اپنی قومی اور ملی تحریک کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن افسوس سندھ کے باہر کے اہل علم اور جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو حضرت مولانا مدظلہ سے استفادہ کرنے کے منتظر ہیں اور اہل سندھ ہیں کہ غفلت میں پڑے ہوتے ہیں۔

اس وقت حیدر آباد (دکن) اور لاہور کے کئی اعلیٰ جدید تعلیم یافتہ مولانا کے پاس ان کے علوم سے استفادے کے لیے آتے ہیں اور بہت سے آنے والوں کی درخواستوں کو اس بنا پر واپس کر دیا گیا کہ ابھی ان معزز مسافروں اور شائقین علم کے قیام وغیرہ کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا ہے۔

حال ہی میں حیدر آباد (دکن) کی عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر فیروز الدین مولانا کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے کہ وہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر عبدالواحد سندھی استاد سندھ مدرسہ کالج (کراچی) بھی دو ماہ کی رخصت لے کر فلسفہ الہیات کی تعلیم کے لیے دو ماہ تک مولانا کے ساتھ مقیم رہے اور بہت کچھ استفادہ کیا۔ ضرورت ہے کہ سندھ کے اہل علم اور انگریزی دان نوجوان اس معمر بزرگ سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں فائدہ اٹھائیں اور ان کے فروغ کے لیے اہل ثروت زیادہ سے زیادہ مالی امداد فرمائیں۔

پچھلے دنوں میں نے بعض مالدار احباب سے گفتگو کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ سندھ کا دولت مند طبقہ عام طور پر مشرقی علوم سے ناواقف ہے وہ امام ولی اللہ دہلوی کے علمی مقام اور ان کے معارف کو نہیں جانتا۔ اس لیے مولانا مدظلہ کا تعارف کرانے میں بھی بہت دقت پیش آتی ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں مجھے اپنے دوست محترم در محمد خان اڈھ زمیندار ضلع جیکب آباد سے بات چیت کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے فرمایا: "۔آپ کو مولانا مدظلہ کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں میں مولانا صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں"۔

میں نے پوچھا۔ "وہ کیسے"؟ وڈیرہ در محمد خان نے فرمایا کہ تم نے مولانا حاجی عبدالوہاب کولاچی کا نام تو سنا ہو گا وہ بالائی سندھ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان بزرگ کے علمی مقام اور وسعت معلومات کا کون قائل نہ ہو گا۔ مولانا حاجی عبدالوہاب نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ میرے پاس گزارا تھا۔ وہ مولانا سندھی کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ آج ہندوستان میں ان سے بڑا کوئی عالم دین نہیں۔ مولانا عبدالوہاب فرماتے تھے کہ ہم لوگوں کے علوم کی جو انتہا ہے مولانا سندھی کے علوم کی وہاں سے ابتدا ہوتی ہے"۔ وڈیرہ در محمد خان اڈھ کے یہ الفاظ سننے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ اب مجھے مولانا سندھی کے بارے میں آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سندھ کے طبقہ امرا میں یہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے حضرت مولانا کے علوم کی اشاعت اور ان کی تحریک کے لیے ایک معقول امداد کا وعدہ کیا ہے۔ فجزاہ اللہ خیر الجزا۔

مجھے امید ہے کہ سندھ کا سمجھ دار طبقہ جیسے جیسے مولانا کے علمی مقام اور ان کے افکار و علوم کی اہمیت سے آشنا ہوتا جائے گا۔ ویسے ویسے اس کام میں مدد کے لیے اس کا ہاتھ کشادہ اور قدم آگے بڑھتے جائیں گے اور وہ دن بھی ہم دیکھیں گے کہ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم و افکار اور مولانا سندھی کی فکری اور عملی تحریک پورے سندھ کا احاطہ کرے گی۔ اور وہ وقت دور نہیں جب سندھ کی آئندہ نسل نہ صرف ملک کی اعلیٰ سیاسیات سے بلکہ خداشناسی کی نعمت سے بھی مالا مال نظر آئے گی۔

(توحید۔ کراچی۔ جون ۱۹۴۳ء)

○ ترجمہ ثناء اللہ سومرو

سندھ ساگر پارٹی

مولانا عبید اللہ سندھی ۷۔ مارچ (۱۹۳۹ء) کو ۲۵ برس کی جلا وطنی کے بعد وطن لوٹے تھے۔ اس واقعے کو ایک سال ہونے والا ہے۔ ان کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کے جو عزائم ہیں، وہ حال ہی میں انہوں نے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے قیام کے اعلان اور اس کے پروگرام کی اشاعت کے ذریعے ظاہر کیے ہیں۔ یہ پروگرام اردو اور سندھی میں چھپ چکا ہے۔ مفصل پروگرام ہم توحید کے آئندہ شمارے میں شائع کریں گے۔ مگر یہاں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ حضرت امام سندھی ایک سال تک ہندوستان کا گشت کرتے رہے۔ انہوں نے لاہور، دہلی، کلکتہ، دیوبند، لکھنؤ، اعظم گڑھ، الہ آباد، بنارس، کلکتہ وغیرہ تک اپنے نئے اور پرانے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور اپنے عزائم و افکار سے ملک کو آگاہ کیا۔ لیکن عملی کام کے لیے انہوں نے اپنے "سندھ دیس" کے میدان ہی کو منتخب کیا۔ اب اسے پورے ملک میں پھیلا دیا جائے گا۔

سندھ ساگر پارٹی کا کام فی الحال مدرسہ دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا۔ ضلع حیدر آباد) سے شروع کیا جائے گا۔ اس پارٹی میں شرکت کے لیے کسی مذہبی عقیدے کی شرط نہیں۔ ہندو مسلمان اور کسی بھی دوسرے فرقے اور مذہب کا جو شخص چاہے پارٹی کا ممبر بن سکتا ہے۔ شرکت کے لیے کوئی چندہ بھی مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ پارٹی کے مقاصد سے فکری اتفاق اور پارٹی مقاصد کے لیے عملاً سعی کے لیے ارکان سے عہد لیا جائے گا۔ ہر رکن امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کے ساتھ منسلک رہے گا۔ مولانا سندھی کا خیال ہے کہ ویدانت تصوف حضرت امام دہلوی کے فلسفہ احکام اسلام کے بہت قریب ہے۔ یہ فلسفہ اتنا فطری ہے کہ کسی بھی مذہب کا کوئی شخص اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔

مولانا عبید اللہ نے سندھ کو اس کام کے لیے کیوں منتخب کیا؟ اس سلسلے میں مولانا نے ایک ملاقات میں فرمایا کہ "سندھ کے لوگ تمام ہندوستان میں زیادہ نیک اور شریف

ہیں اور ان میں کسی فکر کو قبول کرنے کا مادہ دوسروں سے زیادہ پایا جاتا ہے"۔ مولانا نے مزید فرمایا کہ " سندھیوں میں جو خوبیاں ہیں، وہ ہندوستان کے دوسرے لوگوں میں نہیں۔" لیکن سندھ ساگر پارٹی میں شمولیت کے لیے سندھی ہونا شرط نہیں۔ اس میں پنجاب، دہلی، یوپی، بہار، بنگال کا کوئی بھی شخص داخل ہو سکتا ہے۔

ہم یہ بات تجربے کی بنا۔ پر کہہ سکتے ہیں کہ سندھیوں اور ان لوگوں کی جو سندھ میں دو تین نسلوں سے سکونت رکھتے ہیں، طبیعتیں نرالی ہیں۔ سندھی مسلمان فراخ دل، مہمان نواز، ہمدرد اور رحم دل ہوتا ہے۔ خصوصاً دیہات کے سندھی میں یہ اوصاف بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ سندھ کا زمیندار فضول خرچ اور بعض حالات میں بدکار بھی ہے۔ لیکن مہمان نواز اور دل کا نرم وہ بھی ضرور ہے۔ سندھی زمینداروں کے اوطاقوں (چوپالوں) میں مسافروں اور مہمانوں کی تواضع اور خدمت کا جو انتظام ہوتا ہے۔ اس کی نظیر پورے ہندوستان میں کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

اسی طرح سندھ کا ہندو بھی صلح پسند ہے اور دیہات میں معصوم صورت میں پر امن زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ سالہا سال سے مسلمانوں کے ساتھ رہتا چلا آ رہا ہے۔ البتہ شہری ہندو پچھلے پندرہ برس سے اس کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور نفرت دلانے لگا ہے۔ اس سے پہلے دیہات کے ہندو اور مسلمان میں کوئی نفرت یا دشمنی نہ تھی۔

سندھ کے شہری ہندو کو بھی پنجاب کے ہندو نے بگاڑا ہے۔ ورنہ سندھی ہندو شریر اور لچا نہیں، وہ صرف تجارت کرتا، روپیہ کماتا اور کھاتا ہے۔ اس پر سندھی مسلمان نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اس فساد کا بیج ہندو اخباروں اور کانگریسی اور مہاسبھائی لیڈروں نے بویا ہے، جس کی وجہ سے دیہاتی ہندو بھی اکڑ گیا ہے۔

سندھ ساگر پارٹی میں سنجیدہ ہندوؤں کی شمولیت سے یہ نفرت دونوں قوموں کے درمیان سے یقیناً نکل جائے گی، جو پچھلے پندرہ برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خود غرض اور مفاد پرست لوگوں نے پیدا کر دی ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو امید ہے کہ سندھ میں محبت وانسانیت کا وہ دور پھر واپس آ جائے گا، جو پہلے تھا اور ہندو اور

مسلمان صوفیہ کی انسانی تعلیم اور صحبت سے پیدا ہوا تھا۔ وہ دور کیا ہی خوب تھا جب دونوں قوموں کے لوگوں کے دل نفرت، کھوٹ اور دشمنی سے پاک وصاف تھے۔

سندھ ساگر پارٹی میں اگر غیر متعصب اور سنجیدہ ہندوؤں کی تعداد شامل ہو جائے تو یہ امر سندھ کے لیے یقیناً باعث برکت اور نیک شگون ہو گا۔

(توحید، کراچی۔ نومبر دسمبر ۱۹۳۹ء)

○ ترجمہ۔ ثناء اللہ سومرو۔ نظر ثانی۔ ڈاکٹر ابو سلمان سندھی۔

افکار و افادات

مولانا عبید اللہ سندھی

افکار پر ایک نظر

دنیا کے بڑے صوفی، فلسفی، سیاست دان، اسلام کے مجتہد، قرآن و حدیث کے عالم، تاریخ کے ماہر حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے آج پورے بارہ مہینے گزر چکے ہیں۔ مگر ان کی علمی اور عملی زندگی کی یاد ابھی تک ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔

حضرت مولانا نے پچھلے سال ۲۔ رمضان المبارک کو دین پور شریف میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی تھی اور ملاء اعلیٰ کے ان ساکنان سے جا ملے تھے۔ جن سے ملاقات کی آرزو ہمیشہ ان کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ مولانا سندھی کے سامنے جو مذہبی اور قومی و ملکی کام تھے، ان سے وہ کبھی غافل نہیں رہے اور بڑھاپے کی کمزوری اور بیماری کے باوجود وہ قوم و ملت کی رہنمائی اور وطن کی خدمت میں مصروف رہے۔

مولانا مرحوم کے مضامین اور ان کی تقاریر کے مطالعے سے ان کے علم کی گہرائی اور وسعت اور فکر کی بلندی اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے نیز پتا چلتا ہے کہ وہ سیاست کے کتنے بڑے ماہر اور انقلابی فکر کے حامل شخص تھے۔ وہ صرف مسلمانوں ہی کے رہنما نہ تھے بلکہ بلا تفریق مذہب و ملت ہندوستان کی تمام قوموں بلکہ کل انسانیت کی فلاح و بہبود کے جذبات سے ان کا سینہ معمور تھا۔ ان کے نزدیک تمام انسان اللہ کا کنبہ ہیں اور وہ سب کی خدمت کرنا اللہ کی خوشنودی کا موجب سمجھتے تھے۔

مولانا سندھی کے نزدیک کانگریس ایک نیشنل جماعت تھی۔ اس میں مسلمانوں کی شرکت کو وہ ضروری سمجھتے تھے، مسلم لیگ کو وہ ایک رجعت پسند جماعت سمجھتے تھے لیکن مسٹر جناح کے کانگریس سے اختلاف کو ایک لبرل بیرسٹر کی جنگ خیال کرتے تھے۔

ایک دفعہ انہوں نے فرمایا کہ محمد علی جناح کو قائد اعظم کے لقب سے پکارا جانا گاندھی جی کو مہاتما قرار دیے جانے کا رد عمل ہے اور بس یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں۔

حضرت مولانا سندھی ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ بہت سے ملکوں کا مجموعہ مانتے تھے۔ ان کے خیال میں انڈین نیشنل کانگریس کو انڈین انٹر نیشنل کانگریس کہنا چاہیے۔ مولانا کے خیال میں تمام مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو کر اس میں ایک مضبوط بلاک قائم کرنا چاہیے جو غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کا واقعی ترجمان ہو۔

مولانا سندھی ہندوستان کی تمام اقوام کی بھلائی اور ترقی کے خواہاں تھے۔ لیکن وہ فلسفہ جدلیات کے بالکل قائل نہ تھے، لیکن مشین اور ٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی کے زمانے میں ہندوستان کو یورپ کے مقابلے میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں مشین اور ٹیکنالوجی کو ترقی دی جائے۔ مولانا کے خیال میں زمانہ قدیم چرخے کے دور سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

مولانا سندھ میں تعلیم کے عام فروغ کے بہت حامی تھے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے عورت مرد کو تعلیم دینا چاہتے تھے۔ اس کے بغیر وہ سمجھتے تھے کہ عوام میں سماجی اور سیاسی شعور پیدا نہیں ہو سکتا۔ رسوم و روایات کی اصلاح اور زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے تعلیم کا عام ہونا بہت ضروری ہے۔ مولانا غریبوں کے معیار زندگی کو بلند کر کے امیروں اور غریبوں کے درمیان فرق کو کم سے کم کرنا چاہتے تھے۔

حضرت مولانا سندھی اگرچہ ہندوستان کو ایک ملک کے بجائے مختلف ملکوں کا مجموعہ کہتے تھے، لیکن وہ ایک فیڈریشن کے تحت ڈومینین اسٹیٹس کے قائل تھے اور اسی نظام کو وہ بیرونی استعمار سے ملک کی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

زبان کے مسئلے میں مولانا کا خیال تھا کہ اگرچہ اردو ہندوستان کی زبانوں کا ایک مرکب ہے، لیکن وہ ایک اصلی زبان ہے لیکن جو زبان کسی صوبے میں بولی جاتی ہے، اس صوبے میں اسی پر زور دینا چاہیے۔ ایک مستقل زبان رکھنے والے صوبے میں اردو پر زور

دے کر صوبے کو اردو ہندی کے جھگڑے کا میدان نہ بنا دینا چاہیے۔ صوبے کی زبان کو سیکھنا ضروری قرار دیا جائے اور جو سیکھنا چاہے اس کی ہمت افزائی کرنا چاہیے۔ لیکن اصل زور مادری زبان پر دینا چاہیے۔ اردو یا ہندوستانی کو قومی زبان کا درجہ دینا چاہیے ایک جگہ فرمایا ہے کہ اردو نیشنل نہیں انٹرنیشنل زبان ہے۔ اسے کسی نیشنل زبان کی جگہ نہیں لینی چاہیے اس سے لسانی کشمکش پیدا ہو جائے گی اور خرابیاں جنم لیں گی)۔ ایک مرتبہ فرمایا مہاتما گاندھی نے اپنی مادری زبان گجراتی میں لکھا ہے اور ٹیگور کی ساری شاعری بنگلہ زبان میں ہے، وہ ہندی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے لیے وہی زبان سب سے بہتر ہوتی ہے جو کہ بچہ اپنی ماں کی گود میں سیکھتا ہے، لیکن پورے ہندوستان کے لیے ایک رابطے کی زبان کی ضرورت ہے اور وہ اردو، ہندوستانی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔

ملک کے مسائل میں ہندو مسلم یا فرقہ وارانہ مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن یہ بہت آسانی سے حل ہو سکتا ہے سندھ کا ہندو صوفی اچھے خیالات کا مالک ہے۔ ان میں تحمل، بردباری اور نرم مزاجی کی خوبیاں موجود ہیں۔ یہ سبق انہوں نے باہر والوں یا مسلمان صوفیہ سے سیکھا ہے۔ اگر سندھ کے ہندوؤں کی توجہ وحدت الوجود یا ویدانت فلاسفی کی طرف پھیر دی جائے تو وہ بہت آسانی سے اسلامی تصوف کے قائل ہو سکتے ہیں اور مذہبی منافرت اور تعصب کی جو فضا اس وقت موجود ہے، وہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی اور تقریباً تعصبات کے زہر سے سندھ اور پورا ملک محفوظ ہو جائے گا۔ یورپ سے آنے والے انقلاب کے بارے میں مولانا فرماتے تھے کہ یہ بے دینی کا انقلاب جو ہندوستان میں زور و شور کے ساتھ آ رہا ہے اس کے روکنے کی اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں کہ امام ولی اللہ دہلوی کی فلاسفی یا ویدانت تصور کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ اس سے مذہب کی اہمیت اور وحدانیت کا تصور ذہن میں نقش ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس لادینی انقلاب سے پہلے ہم نے ایسا نہ کرلیا تو یہ لادینی کا سیلاب ہمارے مذہب اور

اخلاق و تصوف سب کو بہالے جائے گا اور یہ ملک اور اس کے عوام کی بڑی بد قسمتی ہو گی۔

حضرت مولانا سندھی کا خیال تھا کہ جامعہ ملیہ، دہلی میں بیت الحکمت قائم کیا جائے جہاں خاص انداز سے مذہبی فلاسفی کی تعلیم دی جائے تاکہ ملک مذہبی تعصب کی دلدل اور تنگ نظری کی فضا سے نکل سکے۔

ہمیں خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کی سلور جوبلی کے موقع پر بیت الحکمت کے قیام کا عزم کر لیا ہے اور اس کی عمارت وغیرہ کے لیے پچیس ہزار روپے کی قوم سے اپیل کی ہے۔

آج ہم کھلی آنکھوں سے یہ بات دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا رفتہ رفتہ اس پروگرام کی طرف آ رہی ہے، جس کی طرف حضرت مولانا سندھی نے توجہ دلائی تھی اور اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک وہ جس کے لیے جدوجہد کرتے رہے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کی نجات اور ان کی مشکلات کا حل صرف مولانا سندھی کے بتائے ہوئے پروگرام میں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے اس مقدس بندے کی قبر پر اپنی رحمتوں کی بارش کا نزول فرمائے، جس نے قوم کو سیدھے راستے پر چلانے میں اپنی زندگی صرف کر دی تھی۔

(توحید - کراچی - اگست ستمبر ۱۹۴۵ء)

ترجمہ - آنسہ رخسانہ امیر محمد شہداد کوٹ)

مادیت اور مذہب کا باہمی اتحاد

مولانا سندھی کے افکار کی روشنی میں

۱۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ یورپ کے سفر کے بعد روس کے بڑھتے ہوئے لادینی خطرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے۔ آپ کا فرمانا تھا کہ شاہ ولی اللہ کی تعلیم کی موجودگی میں روس کا لادینی فلسفہ کسی طور بھی ان پر اثر انداز نہ ہوا اور پھر اس مشاہدے سے اسلام کی صداقت پر حق الیقین کا مقام حاصل ہو گیا (۱)

[چوں کہ روس کی لادینی جماعت نے دیکھا کہ زار روس نے عیسائیت کے نام پر غریبوں پر بڑے بڑے ٹیکس لگائے تھے اور انہیں بد حال اور کنگال بنا دیا تھا اور مذہبی عالم یا پادری روس کے دعاگو اور طرفدار تھے، اس لیے عام غریبوں اور انقلاب لانے والے مزدوروں نے یہ سمجھ لیا کہ شاید مذہب میں غریبوں کو کچلنا اور مسکین بنائے رکھنا اور امیروں کا عیاشیاں کرنا جائز ہے، جس کی وجہ سے وہ مذہب سے اس قدر بیزار ہوئے کہ روس میں بادشاہت کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ مذہب (عیسائیت) کا خاتمہ بھی کر دیا۔ اور مزید ایک غلطی انہوں نے یہ کی کہ بہ شمول اسلام تمام مذاہب پر انہوں نے اپنے اس فیصلے کا اطلاق کر دیا۔ (ا۔س)]

۲۔ مگر اسلام کی تو بنیاد ہی انسانیت کی خدمت پر ہے۔ اسلام کی تحریک کی قبولیت مساوات یا نوع انسان کی ایک برادری یا برابری ہے جس کی وجہ سے اسلام نے فارس کی امیرانہ سلطنت اور قیصر روم کی زبردست بادشاہت کا خاتمہ کر کے وہاں پر غریبوں کی حکومت قائم کر دی۔ یہ حکومتیں صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی سربلندی اور مخلوق خدا کی خدمت کے لیے قائم کی گئیں۔ اسلام کی بنیاد ہی غریب پروری پر ہے۔ اس لیے غریبوں کی خدمت کرنے کی حالت میں تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہر لمحہ پیش نظر

رہتی ہے اور اسلام کی تحریک ملک میں چلانے کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں کی خدمت اور غریبوں کی خدمت کے معنی یہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اللہ تعالیٰ کا اقرار (۲)۔

۳۔ یورپ کے اس لادینی کے طوفان میں اللہ کے وجود کے متعلق ہزاروں شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے ہیں، جس کے لیے حضرت مولانا سندھی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے کہ اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے یعنی کہ اسلامی تصوف، اسلامی تصوف۔ میں چیزوں کی حقیقتوں سے بحث کی گئی ہے اور یہ کہ دنیا کی چیزوں کی اصل کیا ہے، ان کے سمجھنے سے پہلے خود شناسی اور پھر خدا شناسی ہوتی ہے جس کے بعد کافی شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

۴۔ حضرت مولانا سندھی مرحوم کا ارشاد تھا کہ یورپ کا انقلاب مادی انقلاب ہے۔ یورپ نے صرف مادہ ہی کو زندگی کا اصل مقصد سمجھ لیا ہے یعنی جو کچھ بھی ہے صرف دنیاوی چیزیں ہیں اور یہ ہی زندگی ہے جس میں سب کچھ ہے لیکن آگے چل کر یہ مادی انقلاب روحانیت کی طرف بھی ضرور توجہ مبذول کرائے گا اور انسان ان چیزوں کے پیچھے روحانیت کے متعلق بھی سوچنے لگیں گی۔

[یعنی مولانا سندھی کے نزدیک مادی تصور کی انتہا لازماً یہ ہوگی اور رد عمل کے نتیجے میں مذہبی انداز فکر ضرور پیدا ہو گا۔ انسان اپنے جسم کی ضروریات کی تکمیل پر ہی اکتفانہ کرے گا بلکہ اپنے دماغ اور قلب کی تسکین کا بھی خورہاں ہو گا۔ (ا۔ س)]

جس کو تصوف کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے یا خود یہ سوچنا تصوف ہے اس سلسلے میں مولانا سندھی مرحوم کے اپنے الفاظ ہیں (۳)۔

"میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی علم اور سائنس کی ترقیوں کو ہم زندگی کی اساس کی حیثیت دیں۔ لیکن یہ نہ سمجھیں کہ سائنس نے ساری زندگی کا احاطہ

کر لیا ہے۔ بے شک سائنس نے مادی زندگی میں جو انکشافات کیے ہیں، وہ سب صحیح ہیں۔ لیکن زندگی صرف مادہ تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ مادہ کسی اور وجود کا پرتو ہے اور اس وجود کا مرکز ایک ذات ہے، جو خود زندگی ہے اور زندگی کا سہارا اور باعث بھی۔ وہی ذات "الحیی القیوم" ہے۔ میں مادیین کے تصور کائنات کو سرے سے غلط نہیں مانتا، لیکن اسے ناقص ضرور سمجھتا ہوں۔ مادی فکر کا منکر نہیں ہوں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ مادیت حقیقت کا صرف ایک رخ ہے۔ اور یہ رخ بے شک حقیقت کے ایک پہلو کا صحیح ترجمان ہے، لیکن حقیقت کا ایک پہلو اور بھی ہے، جو مادہ سے ماورا اور بالا تر ہے اس کو شرعی زبان میں "آخرت" کہا گیا ہے۔ زندگی کا مادی تصور حیات اس لحاظ سے ناقص ہے کہ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی رونمائی کرتا ہے۔ لیکن زندگی کا صحیح اور مکمل تصور "آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة" ہے اور یہی تصور ہے، جو زندگی کی ساری مادی اور ماورائے مادی کائنات پر حاوی ہو سکتا ہے"۔

(مولانا عبید اللہ سندھی، از محمد سرور۔ ص ۷۰)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ صرف ذہن کو آگے بڑھانے کے لیے یورپ کی مادی سائنس یا مادیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان دنیاوی چیزوں کو زندگی کا مالک نہ سمجھا جائے بلکہ تھوڑا سا آگے بڑھ کر یہ تصور کیا جائے کہ زندگی صرف اس دنیا ہی میں ختم نہیں ہے بلکہ اس سے باہر بھی ہے۔ یہ ذات پاک ساری کائنات کے مرکزی نقطے کا حکم رکھتی ہے اسلام نے اس ذات کو ماننے کے لیے صاف الفاظ میں حکم دیا ہے اور مسلمان صوفیہ نے اس کو دلائل اور حقائق کے ساتھ رموز و اشارات و امثال کی زبان میں بھی سمجھایا ہے۔

گویا حقیقی تصوف اسلام کی روح سے آشنا کر دینے کا علم اور ایک فلسفہ ہے، جس کو سمجھنے کے بعد اسلام کی حقانیت میں کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں رہتی۔

۶۔ حضرت مولانا صاحب کا ارشاد تھا کہ خداشناسی کے لیے شاہ صاحب کی کتب ہمعات اور سطعات ابتدائی طور پر پڑھائی جائیں۔ اور اس ارادے سے خود دہلی اور دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا میں بیت الحکمت کی بنیاد رکھی اور ان کے شاگردوں میں سے کئی نوجوان عالم اس وقت اس کام میں مصروف ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ آواز انگریزی کالجوں تک پہنچائی جائے۔ اس طرح سے مادیت اور مذہب کا آپس میں اتحاد ہو جائے گا۔ اور یورپ کی مادی ترقی کے ساتھ مسلمان نوجوان خداشناسی کی نعمت سے مالا مال ہو کر دنیا پر حکمرانی کرتا نظر آئے گا۔

ترجمہ۔ پروفیسر جمشید علی خان۔ کراچی (الوحید۔ کراچی، مارچ ۱۹۴۶ء)

حواشی:

(۱) پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں:

"مولانا خود اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ میں وطن سے نکلا، افغانستان پہنچا۔ وہاں مجھے نئے حالات سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ بزرگوں کی بتائی ہوئی اور سوچی باتیں سب بے کار ہو گئیں۔ روس گیا تو بالکل اور دنیا نظر آئی۔ جن مزعومات اور عقائد میں میری ساری زندگی گزری تھی۔ روس میں اس کو ایک ایک کر کے ٹوٹتے اور مٹتے دیکھا اور نئے اصولوں پر زیادہ جاندار اور زیادہ مستحکم نظام بنتے کا مشاہدہ کیا۔ پھر ترکی میں بھی کم و بیش یہی کچھ میرے سامنے ہوا"

وہ فرماتے ہیں کہ اس تمام زمانے میں مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مذہب کے اساسی عقیدہ پر شک و شبہ نہیں ہوا۔ میرا دینی فکر روسی انقلابیوں کے لادینی فکر سے بلند تر رہا اور ان کی تمام مادیت کو میرے الٰہی فکر نے اپنے اندر ہضم کر لیا۔ دوسرے لفظوں میں مولانا کا دینی عقیدہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اشتراکیین کی مادیت کو قبول کرنے کے بعد بھی خدا تعالیٰ کے وجود پر ان کا ایمان متزلزل نہیں ہوا"۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ سب شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا فیض اور ان کے پیش کردہ وحدت الوجود کے عقیدہ کا اثر تھا۔ یعنی انقلاب کے ان طوفانوں کے مقابلے میں جن کی بڑے بڑے تاب نہ لا سکتے تھے، مولانا محض تصوف کی برکت سے اسلام پر ثابت رہے۔" (مولانا عبید اللہ سندھی، ص ۱۳۲)

(۲) اسلام کے نزدیک بلا تفریق مذہب و قوم عامہ خلائق کی فلاح و بہبود اور خدمت کے تمام کام حکومت کے فرائض میں شامل ہیں اور ان کی انجام دہی اللہ کی خوشنودی اور رضا کا موجب ہے۔ عامہ خلائق کی خدمت میں رضائے الٰہی کے مفہوم پر ایک حدیث نہایت فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے اور مولانا سندھی مرحوم ہی نے اس کا مفہوم بیان فرمایا ہے۔

فرماتے ہیں:

"اسی مضمون کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بھی مروی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہ دیا۔ بندہ حیران ہو کر کہے گا کہ اے باری تعالیٰ تو تو بھوک سے بے نیاز ہے۔ تجھے کھانے کی کیا حاجت پھر ارشاد ہو گا کہ میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ اور پھر پوچھے گا کہ میں ننگا تھا تو نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ ہر سوال کے جواب میں بندہ کہے گا کہ اے میرے رب تجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت تو تو ان سب سے بے نیاز ہے۔ اس وقت خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا ایک بندہ بھوکا تھا، تو نے اسے کھانا نہ کھلایا، وہ پیاسا تھا تو نے اسے پانی نہ دیا، وہ ننگا تھا تو نے اسے لباس نہ پہنایا"۔

مولانا کا کہنا ہے کہ صحیح خدا پرستی آگے چل کر لازماً انسانی دوستی کا موجب ہوتی ہے"۔

(م) مولانا وفائی مرحوم نے اس مقام پر مولانا سندھی کے جس بیان کا سندھی میں ترجمہ کیا تھا اسے اصل ماخذ سے لے کر اس مقام پر شامل کر دیا گیا (ا۔ س)

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی

کے ارشادات

مولانا عبید اللہ سندھی ۲۵ برس کی جلا وطنی کے بعد جب وطن واپس لوٹے تھے تو بہت سے تجربات دنیا کے مشاہدات اور فکر و بصیرت کا بڑا سرمایہ ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے ایک پروگرام پیش کیا تھا۔ وہ پروگرام "سندھ ساگر پارٹی" کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ حضرت امام انقلاب نے اس میں جو کچھ فرمایا ہے اگر اس پر عمل کیا جاتا تو ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل اور دفاع کے لیے ایک ہی طریقہ بتایا تھا کہ ملک میں وحدت الوجود یا ویدانت فلاسفی کی بنیاد پر اتحاد قائم کیا جائے۔ مولانا سندھی مرحوم کو پختہ یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ہمہ اوست (وحدۃ الوجود) کے فکر پر متحد ہو سکتے ہیں۔ اسی فلسفے کے مطابق انسانیت عامہ کے اصول پر مذہب تمام دھرموں اور فرقوں میں تطبیق دی جائے۔ اس طرح ایک انسان کی دوسرے انسان سے جو مذہبی نفرت اور تعصب ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اب تک ملک میں جو کوششیں کی جاتی رہی ہیں ان کی بنیاد چوں کہ صحیح فکر پر نہ رکھی گئی تھی اس لیے وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ اگر ویدانت فلاسفی کو سامنے رکھ کر یہ کام اس طریقے پر شروع کیا جاتا، جس طرح ہندوستان میں باہر سے آنے والے صوفیہ کرام نے شروع کیا تھا، تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ نفرت یقیناً نہ ہوتی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

حضرت مولانا سندھی کی حقیقت بین نگاہیں فرقہ وارانہ مذہبی نفرت انگیز سیاست کے نتائج اور اس موجودہ تباہی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لیے اس بزرگ مدبر نے اپنی

تقاریر، صدارتی خطبوں اور مجلسوں کی گفتگو میں بار بار زور دے کر کہا کہ مسلمانوں کو اپنے اور مستقبل میں اسلام کے وقار کی خاطر انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیے اور کانگریس سے اپنا پروگرام منوا لینا چاہیے۔ موجودہ کانگریس مولانا کے مفاد پر پوری نہیں اترتی تھی۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کی اس سے دوری نے اسے گاندھیائی یا گاندھی فلاسفی کے پیرو کاروں کی جماعت بنا دیا ہے۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ کانگریس کو مذہبی تصورات سے صاف کر کے خالص نیشنلسٹ پارٹی بنایا جائے اور مسلمانوں کو مذہبی تعصبات سے الگ ہو کر قومی اور ملکی خدمت کے میدان میں عامہ خلائق کے فائدے کے کاموں میں سرگرم ہونا چاہیے۔

ایک دفعہ مولانا سندھی نے ایک مجلس میں یہ بھی فرمایا کہ اگر مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں ناکام ہوئے، فرقہ وارانہ سیاست ترک نہ کی اور مذہبی رنگ میں الگ کام کرتے رہے اور ہندوستان کو ڈومینیں اسٹیٹس حاصل ہو گیا اور اس حالت میں اگر پٹیل پارٹی غالب آ گئی تو ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا جائے گا۔ اور اگر گاندھی پارٹی غالب آئی تو اگرچہ مسلمانوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے گا مگر اس شرط پر کہ وہ

یہ بات مولانا نے ۱۹۴۲ء میں دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) میں فرمائی تھی۔ اس مجلس کے سامعین میں مولوی حاجی عبدالقادر صاحب مہتمم مدرسہ دارالرشاد بھی تھے۔

اس بوڑھے فلاسفر کی باتوں کو مسلمانوں نے نہ صرف سنی ان سنی کر دیا بلکہ اس کو دیوانہ پاگل اور سنکی کہا گیا اور اس کی بے عزتی تک کی گئی۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ انہوں نے ۱۹۴۲ء میں جو کچھ فرمایا تھا، ۱۹۴۷ء میں ایک تاریخی حقیقی صورت میں سامنے آ گیا، ہندوستان میں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی ہے اور ان کی جو مظلومانہ حالت ہو رہی ہے ان میں ہمارا پاکستان ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

حضرت امام سندھی اپنے وسیع تجربات کی روشنی میں یہ بات زور دے کر بار بار فرمایا کرتے تھے کہ بیرونی دنیا کے مسلمانوں سے امداد کی کوئی امید نہ رکھنا، دوسروں کی امداد

پر بھروسا کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی طاقت اپنے ہی ملک میں تلاش کرنی چاہیے انہیں ہندوؤں کی عددی اکثریت سے بالکل نہ ڈرنا چاہیے اس لیے کہ صحیح پروگرام کی بدولت اقلیت اکثریت پر راج کر سکتی ہے۔ مگر مولانا کی ان باتوں پر کسی نے کان نہیں دھرا اور "اسلام خطرے میں ہے کے پرشور نعروں سے ہندوستان کی فضا گونج اٹھی۔ کہا گیا تھا کہ پاکستان میں جانے کے بعد ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت بھی کر سکیں گے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ پاکستان بن گیا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ اب بتائیے کہ فرقہ وارانہ اور نفرت انگیز سیاست کی بنا پر جو مسلمان ریاست حاصل ہوتی ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کچھ بھی مدد کر سکی ہے؟

(توحید، کراچی۔ اکتوبر نومبر ۱۹۴۷ء)

○ ثناءاللہ سومرو نے اس مضمون کا ترجمہ کیا اور ڈاکٹر ابو سلمان سندھی نے اس پر نظر ثانی کی۔

افادات علمیہ حضرت امام سندھی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی دنیا کے ان علماء میں سے ہیں جن کو علمائے ربانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا شمار عالم اسلام کے نہایت قابل فخر زعماء میں ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف میرا خیال ہے بلکہ مکہ معظمہ افغانستان روس، اور ترکی کے قیام کے زمانے میں ان ممالک کے علماء نے انہیں ایک زبردست عالم دین اور سیاسی مفکر تسلیم کیا ہے۔ حضرت مولانا سے میرا ایک خاص عقیدت کا تعلق ہے۔ ۱۹۲۲ میں سفر حج کے موقعہ پر حضرت مولانا سے جو ملاقاتیں ہوئی تھیں، ان میں مجھے مولانا سے بہت استفادے کا موقع ملا تھا۔ اس کے باوجود دل میں ان سے ملاقات کی ہمیشہ آرزو رہی تھی اور دعا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی صحبت اور استفادے کا موقع عطا کرے۔ الحمد للہ کہ حضرت مولانا مدظلہ اب ۲۵ سالہ جلا وطنی کے خاتمے کے بعد وطن تشریف لے آئے ہیں اور کراچی میں شیخ عبدالمجید سندھی صاحب کے گھر پر نہایت قیمتی علمی افادات سے لوگوں کو مستفید فرماتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ وہ قلم بند کر کے قارئین توحید تک پہنچائے جائیں تاکہ ان مجالس کے حاضرین اور شرکاء کے علاوہ ان کا فیضان زیادہ وسیع حلقے میں پھیل سکے۔

۱۔ ایک دفعہ دوران گفتگو میں آپ نے فرمایا کہ قرآن مقدس ایک انقلابی کتاب ہے۔ ہر تعلیم یافتہ کو چاہیے کہ اس پر غور و فکر کرے۔ خالی ترجمہ پڑھ لینے سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ قرآن سمجھنے کے لیے قرآن جاننے والے عالم کے علاوہ تھوڑی سی عربی لغت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان دوسری بہت سی کتابیں تو پڑھتے ہیں لیکن قرآن حکیم پڑھنے اور اس پر غور و فکر کرنے پر توجہ نہیں کرتے۔

۲۔ مولانا نے فرمایا کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے دو چیزوں کی ابتداء میں ضرورت ہے

۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر کے نام سے فارسی میں علم و اصول تفسیر میں جو رسالہ ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے اسے بغور پڑھا جائے اور شاہ صاحب رحمہ کا فارسی ترجمہ قرآن "فتح الرحمن" اس کے ساتھ رکھا جائے، تب امید ہے کہ قرآن حکیم کے مطالب پڑھنے والوں کی استعداد اور فہم کے مطابق ان پر کھلنے لگیں گے۔

۳۔ قرآن حکیم کو سمجھنے کے بعد اس پر عمل کرنے کے لیے بہترین کتاب امام مالک کی موطا ہے۔ شاہ صاحب نے مسوّیٰ کے نام سے جو شرح لکھی ہے۔ وہ سامنے رکھنا چاہیے اور کسی استاد سے اسے سمجھنے میں مدد لینی چاہیے۔ اس طرح فہم قرآن کے علاوہ عمل کا راستہ بھی کھلتا جائے گا۔

۴۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ بہت سے علماء کا خیال ہے کہ حدیث کی کتب میں سب سے زیادہ صحیح کتاب صحیح بخاری ہے اور اس کے بعد صحیح مسلم کا درجہ ہے۔ ان کے بعد دوسری کتب حدیث کی باری آتی ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ تمام کتب احادیث میں موطا امام مالک مقدم ہے۔ قاضی عیاض محدث اور کچھ دوسروں کی بھی یہی رائے ہے۔ میرے نزدیک بھی یہ بات دلائل سے ثابت ہے کہ موطا امام مالک جیسی صحیح کتاب دوسری نہیں۔ اور اسناد، رواۃ وغیرہ کی پختگی کے لحاظ سے یہ کتاب پہلے نمبر پر رکھنے کے لائق ہے۔

۵۔ مولانا نے فرمایا کہ اسلام کا فلسفہ سمجھنے اور قرآن شریف کے مطالعے کے لیے میں نے اپنا امام شاہ ولی اللہ کو تسلیم کیا ہے۔ اب جو عالم یا گریجویٹ شاہ صاحب کو امام تسلیم کر کے مجھ سے قرآن حکیم سمجھنے کی کوشش کرے گا تو میں اس کو بہت آسانی کے ساتھ سمجھا سکتا ہوں اور اگر کوئی غیر مسلم بھی قرآن سمجھنا چاہے گا تو اس کو بھی اسی طرح سمجھا سکوں گا جس طرح ایک مسلمان کو سمجھایا جائے گا۔

۶۔ آپ نے فرمایا کہ شاہ عبدالعزیز ابن شاہ ولی اللہ دہلوی خالص حنفی مذہب کے پابند تھے، لیکن شاہ ولی اللہ حنفی اور شافعی دونوں مذہبوں کے مجتہد تھے۔ دہلی میں شاہ ولی اللہ کی تعلیم کے لیے جو سلسلہ قائم کیا گیا تھا وہ مسلک بالا کے مطابق تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء

کے بعد وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اس کا نقش ثانی دیو بند میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے قائم کیا۔

۷۔ اسی سلسلے میں مولانا نے مزید فرمایا کہ دیو بندی علما۔ کے الگ الگ دائرے ہیں ۔ پہلا اور اعلیٰ دور وہ ہے جس میں کسی بھی حدیث کو اس کے مقام پر تسلیم کرنے کے بعد حنفی فقہ کے کسی جزیے کو اس کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اور یہ ہے حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیم کا اصل منشا۔ بعد کے اور موجودہ دور میں فقہ کے مسئلے کو اپنی جگہ پر تسلیم کرکے اس کی تائید کے لیے حدیث تلاش کی جاتی ہے یہ حنفیت میں غلو اور زیادتی ہے ۔ اس قسم کے علما۔ میں سے سید محمد انور شاہ مرحوم (کشمیری) سمجھے جاتے تھے۔ مگر یہ طریقہ اکابر دیو بند کے مسلک کے مطابق نہیں۔

(ماہنامہ توحید، کراچی۔ مارچ ۱۹۳۹ء)

ترجمہ ثناءاللہ سومرو

مولانا عبید اللہ سندھی

افکار کے آئینے میں

مولانا عبید اللہ سندھی دنیا کے بہت بڑے صوفی، فلسفی، سیاست دان، اسلام کے مجتہد، قرآن و حدیث کے عالم اور تاریخ و فلسفہ تاریخ کے ماہر تھے۔ انہیں اس دنیا سے رخصت ہوئے پورے بارہ مہینے گزر چکے ہیں لیکن ان کی یاد دلوں میں آج بھی زندہ ہے اور وہ تصور میں اسی طرح چلتے پھرتے اور اپنے افکار کے پھول بکھیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حضرت مولانا پچھلے سال رمضان المبارک کی ۲ تاریخ کو دین پور شریف میں وفات فرما کر ملاء اعلیٰ کی اس جماعت سے جا ملے تھے جس کی ملاقات کا انہیں ہمیشہ اشتیاق رہا تھا۔ وہ جن سیاسی و مذہبی مقاصد کو سرانجام دینا چاہتے تھے، انہیں صحت کی خرابی کے باوجود زندگی کے آخری لمحوں تک انجام دیتے رہے۔ انہیں بہت معمر اور کمزور ہو جانے کے باوجود ملک و قوم کی صحیح معنی میں خدمت انجام دینے اور ان کی فلاح و بہبود کے منصوبے پر عمل کرنے کی دھن سوار تھی۔ مولانا مرحوم کی تقریریں، مضامین، رسائل اور بعض جلسوں کے صدارتی خطبے پڑھیں تو ان کے پاک و بلند عزائم کا اندازہ ہوتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ وقت کا یہ مدبر دنیا کو کہاں لے جانا چاہتا تھا اور انسانیت کا مقام اور مستقبل اس کی نظر میں کتنا بلند تھا۔

١۔ حضرت مولانا سندھی نے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں قومی سے جماعت کی حیثیت سے صرف کانگریس ہی کو قبول کیا تھا اور بس۔ مسلم لیگ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ایک آزاد خیال بیرسٹر صرف کانگریس سے دشمنی کی خاطر اس کے پلیٹ فارم کو استعمال کر رہا ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ہندو قوم نے گاندھی جی کو مہاتما کے لقب سے ملقب کیا۔ اس کے جواب میں مسٹر جناح کے پیروکاروں نے انہیں قائداعظم کا لقب دیا ہے۔ یہ دونوں لفظ معنی میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

٢۔ حضرت مولانا ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ متعدد ممالک کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی رائے تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس کو انڈین انٹرنیشنل کانگریس کہنا چاہیے۔

٣۔ مولانا کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہو کر اس میں اپنی ایک مضبوط پارٹی بنانی چاہیے جو اپنی تمام آراء کانگریس کے سامنے رکھتی رہے اور انہیں منوانے کی کوشش کرتی رہے۔

٤۔ ترقی کے لیے مولانا جدلیات کے فلسفے کے ہرگز قائل نہیں تھے۔ بلکہ مشین کی اہمیت کو سمجھانا اور اس کی قوت سے کام لے کر ملک کو یورپ کے مقابلے میں لا کھڑا کرنا چاہتے تھے۔

٥۔ مولانا کا خیال تھا کہ سندھ میں تعلیم کو اس قدر عام کر دیا جائے کہ کوئی کسان اور مزدور نوشت و خواند سے ناواقف نہ رہ جائے۔ وہ کسان کی زندگی کو بلند کرنے کے لیے ان کے گھروں اور بستی کی صفائی اور صحت کے مسائل پر بہت زور دیتے تھے۔

٦۔ حضرت مولانا اگرچہ ہندوستان کو متعدد ممالک کا متحدہ براعظم سمجھتے تھے، لیکن ان ممالک کی الگ الگ آزادی کے بجائے ان کی ایک فیڈریشن کے قائل تھے ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے ممالک کا غیروں کی یلغار اور قبضہ و تصرف سے اسی طرح دفاع ممکن ہو سکتا ہے۔

٧۔ مسئلہ زبان کے بارے میں حضرت مولانا کا خیال تھا کہ اگرچہ اردو ہندوستان کی

ایک مشترکہ زبان ہے لیکن وہ حقیقی زبان نہیں ہے۔ وہ بر عظیم کی مختلف قوموں میں رابطے کی ایک اہم زبان ہے۔ لیکن صوبوں میں ان کی اپنی زبانوں کو ترقی دینی چاہیے۔ کسی صوبے کو اردو ہندی جھگڑے کا اکھاڑہ نہ بنانا چاہیے۔ صوبائی زبانیں اختیاری زبانیں کر دی جائیں، جو ان کو سیکھے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اصل زور علاقائی زبان پر دیا جائے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ۔

"ہندی ہندوستانی کا ملک میں اتنا ہنگامہ برپا ہے لیکن مہاتما گاندھی جو کچھ لکھتا ہے وہ صرف اپنی علاقائی زبان گجراتی میں اسی طرح ٹیگور کی تمام شاعری بنگالی میں تھی وہ ہندی، ہندوستانی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ اسی لیے پورے ملک کے لیے ہندی یا ہندوستانی (اردو) کا ہونا بے حد مشکل سوال ہے۔ ہر ایک علاقے کے لیے وہی زبان ٹھیک ہے جو بچہ اپنی ماں کی گود میں سیکھ کر بڑا ہوتا ہے"۔

۸۔ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ سندھ میں یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ سندھ کا ہندو صوفیانہ خیالات اور اچھے چال چلن کا مالک ہے۔ اس کو نفرت اور دشمنی کا سبق باہر والوں نے سکھایا ہے۔ سندھ کے ہندو کو اگر وحدۃ الوجود یا فلسفہ ویدانت کی طرف متوجہ کر دیا جائے تو وہ بہ آسانی اسلامی تصوف کا قائل ہو جائے گا اور مذہبی نفرت جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھیلا دی گئی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی۔

۹۔ یورپ سے آنے والے انقلاب کے بارے میں حضرت مولانا فرماتے تھے کہ ہندوستان میں یورپین لادینی انقلاب پورے زور سے آ رہا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ تصوف اور ویدانت کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ اس طرح اللہ کی وحدانیت اور مذہب کا تصور ذہن میں قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندوستان خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے، وہ آنے والے انقلاب میں لادینیت کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے گا۔

۱۰۔ حضرت مولانا کا خیال تھا کہ دہلی کی جامعہ ملیہ میں اس کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر

حسین جامعہ کی سلور جوبلی کے موقعے پر بیت الحکمت کی بنیاد رکھنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں، جس کی عمارت اور بعض دیگر ضروریات کے لیے انہوں نے پچیس ہزار روپے کی اپیل کی ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کا جو فکر اور پروگرام تھا، ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا اس کی جانب کھنچی چلی جارہی ہے۔ خواہ دنیا والے یہ بات خود نہ سمجھتے ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات کے لیے واحد راستہ حضرت کا بتایا ہوا پروگرام ہے۔

اللہ تعالیٰ اس مقدس بزرگ کی قبر پر ان رحمتوں کی بارش کرے، جس نے اپنی پوری زندگی قوم کو سیدھی راہ پر چلانے کی سعی میں صرف کردی۔

(توحید، کراچی۔ اگست ستمبر ۱۹۴۵ء)

○ ترجمہ ثناء اللہ

ملفوظات مولانا عبید اللہ

(۱) حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مدظلہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ قرآن مجید کے متعلق مسلمان دو حصوں میں بٹے ہوتے ہیں:

(الف) ایک وہ ہیں جو قرآن مجید کو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں، لیکن وہ قرآن مجید غیر مسلموں اور لادین لوگوں کو نہیں سمجھا سکتے۔

(ب) دوسرے وہ نوجوان ہیں جو قرآن مجید کو کلام الٰہی سمجھتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ وہ پرانے زمانے کی کتاب ہے اور عربوں کی طبیعت کے مطابق ہے۔ اس زمانے میں اس پر عمل کرنا مشکل بھی ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

مولانا مدظلہ نے فرمایا کہ ترکی انقلاب کے شروع زمانے میں جب مصطفی کمال پاشا سے پوچھا گیا کہ آپ قرآن مجید پر اپنی حکومت کی اساس کیوں نہیں رکھتے تو انہوں نے بہت سے ترک علماء کو چائے کی دعوت دی اور جب وہ آتے تو ان سے کہا کہ سورہ و التین کا ترجمہ کریں اور اس کا مطلب بتائیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے لیکن علماء انہیں مطمئن کرنے سے قاصر رہے۔

مولانا نے فرمایا کہ جس ترک نوجوان نے مجھے یہ قصہ سنایا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں تمہیں اس کا مطلب بتاتا ہوں۔ پھر میں نے اس کی خواہش پر ایک مجلس میں اسے

" والتین " کا مطلب سمجھایا اور اس نے اعتراف کیا کہ اگر اس طرح قرآن شریف کو سمجھایا جائے تو کسی انسان کو کوئی اشکال باقی نہ رہے ۔ اور قرآن مجید ایک مقدس صحیفے کے بجائے ہماری عملی زندگی کا رہنما بن جائے ۔

(۲) مولانا صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ قرآن مجید سمجھنے کے لیے ہمارا ولی اللہی جماعت کا ایک اپنا علیحدہ طریقہ ہے ہم اس طریقے سے مسلمان اور غیر مسلمان ہر شخص کو دل نشیں انداز میں قرآن سمجھا سکتے ہیں اس میں نہ کوئی شک رہے گا نہ اعتراض ہم قرآن مجید کو ایک انقلابی کتاب کی شکل میں پیش کرتے ہیں جس کی بنیاد پر پہلے بھی انقلاب آیا ہے اور دنیا میں بڑی بڑی بادشاہتیں قائم ہو چکی ہیں اور انسانیت کی فلاح و بہبود اور خدمت و اصلاح کے عظیم الشان اعمال انجام دیے گئے ہیں۔ اگر آج بھی قرآن کو اسی انقلابی انداز میں اور انسانیت کی خدمت و اصلاح کے عالم گیر پروگرام کی حیثیت سے پیش کیا جائے تو کوئی فرد بشر ایسا نہ ہو گا جو اسے قبول کرنے سے انکار کر دے اور اس کی عظمت کا قائل نہ ہو جائے ۔ مولانا نے فرمایا کہ انہوں نے جب قرآن کو اس طرح روس کے لادین لوگوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اس کے قائل ہو گئے ۔

(۳) ایک دفعہ مولانا نے فرمایا کہ ترکی کے ایک بڑے عالم نے مجھ سے بعض مسائل میں گفتگو کی ۔ میں نے انہیں شاہ ولی اللہ کا مسلک سمجھایا اور ان کی تعلیمات کی روشنی میں ان کا پروگرام انہیں سمجھایا ۔ انہوں نے کہا " ہم شاہ ولی اللہ کو جانتے ہیں وہ دوسرے دن شاہ صاحب کی کتاب " حجۃ اللہ البالغہ " کا ایک عمدہ نسخہ لے آئے جو امام غزالی کی کتاب " احیاء العلوم " کے حاشیے پر استنبول کے عمدہ ٹائپ میں چھپا ہوا تھا ۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ وہ واقعی شاہ ولی اللہ کے نام اور ان کی حکمت سے واقف ہیں ۔

(۴) مولانا نے فرمایا کہ اکبر کو تاریخ میں ایک بے دین اور بد مذہب بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور اورنگ زیب عالم گیر کو ایسے کٹر اور متعصب مسلمان کی

حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو اس سے نفرت ہو جائے اور ہندوستان کی تاریخ سے اس کا نام ضائع کر دیا جائے حالانکہ اورنگ زیب کا طرز عمل وہی تھا جو اکبر اعظم نے متعین کیا تھا اور جس طرح اکبر نے ہندوستانی اسلامی حکومت قائم کی تھی اسی طرح اورنگ زیب کی ہندوستانی حکومت تھی۔ فرق یہ تھا کہ اکبر ان پڑھ تھا اس سے بعض علماء نے غلطیاں کروائیں اور بدنام ہوا۔ اس کے مقابلے میں اورنگ زیب بڑا عالم تھا، وہ غلطیوں سے بہت حد تک محفوظ رہا۔ لیکن اس کی اسلامی حکومت کی پالیسی وہی تھی جو اکبر نے بنائی تھی۔ اورنگ زیب کی نظر میں بھی ہندوستان کے باشندے انہی رعایات کے مستحق تھے جن کے مستحق اکبر کے عہد میں تھے۔ حکومت کے معاملات میں دونوں نے ہندو مسلمان کی تفریق روا نہ رکھی تھی۔ لیکن تاریخ میں عالم گیر کی ان تمام رعایات کے تذکرے کو جو اس نے غیر مسلموں کے لیے روا رکھی تھیں نظرانداز کر کے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے متعلق ایک عام بد ظنی پیدا کی جاتی ہے اور مسلمانوں کو بھی عالم گیر کے اصول حکومت سے ناواقف رکھا جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ دنیا میں جو بڑے مسلمان بادشاہ گزرے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے چار مغل بادشاہ اکبر اعظم، جہاں گیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالم گیر۔ بہت بڑے بادشاہ گزرے ہیں۔ انہوں نے بلا تفریق مذہب انسانیت کی بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں۔

نوٹ :- مولانا فرماتے ہیں کہ اکبر کی غلطیوں کی اصل وجہ علمائے وقت تھے۔ اس کی طرف امام ربانی مجدد الف ثانی نے بھی اشارہ کیا ہے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"در قرن ماضی ہر بلائے کہ بر سر آمد از شومی ایں جماعت (علماء سو) بود۔ بادشاہان را ایشاں از راہ میبروند و ہفتاد و دوملت کہ راہ ضلالت اختیار کردہ اند مقتدایان اینہا علماء سو بودند

(مکتوب ۴۷) (دفتر اول ص ۹۱، حصہ دوم)

(۵) ایک دفعہ سورہ مزمل کا درس دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ عیسائی پادریوں کا

پروپیگنڈا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی پیغمبرانہ نہ تھی۔ وہاں نہ جہاد تھا اور نہ مقابلہ ومقاتلہ تھا۔ بلکہ دشمنوں کو معاف کیا جاتا تھا لیکن ہجرت کے بعد مدینہ میں آپؐ نے اپنا اصول بدل دیا اور مخالفوں سے جنگیں شروع کر دیں اور مکہ والی خاموشی اور عفو ودرگزر کے پیغمبرانہ اصول سے ہٹ گئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کا اصول مکی زندگی کا مقرر کیا ہوا تھا۔ جیسا کہ سورہ مزمل میں اس کا ذکر ہے اور یہ سورہ بعثت نبوی کے بعد کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں نہ کسی اصول سے ہٹے، نہ کسی پچھلے اصول کے برعکس کوئی نیا اصول بنایا۔ مکی زندگی میں ہر بات کی تکمیل ہوتی تھی جس پر مناسب موقعوں پر عمل کیا گیا تھا۔ اور اس طرح پیغمبرانہ شان ہر حالت میں یکساں طور پر قائم رہی۔

(۶) ایک مرتبہ شام کے وقت بعد نماز مغرب ایک مجلس میں مولانا نے فرمایا کہ اورنگزیب عالم گیر کے زمانے میں ہندوستان اتنا خوش حال تھا کہ صرف دو صوبوں کی آمدنی سے ایران کی پوری مملکت خرید لی جا سکتی تھی اور عالم گیر کی طاقت روئے زمین پر تسلیم شدہ ہے۔ ہندوستان کے حاجیوں کو سمندر کے راستے سے سفر میں لٹیروں سے جو تکلیفیں پہنچتی تھیں اور خطرات لاحق تھے ان کے پیش نظر جہانگیر اور شاہجہاں کی کوشش تھی کہ ایران پر قبضہ کرکے حاجیوں کے لیے خشکی کا راستہ جاری کیا جائے۔ عالم گیر نے اس کے لیے پوری ہمت سے کوشش کی، لیکن جنوبی ہندوستان میں جو شیعہ ریاستیں تھیں انہیں ایرانی سلطنت نے اندرونی فسادات پر آمادہ کیا اور مرہٹوں کی مدد سے جنوب کے شیعہ ہمیشہ عالم گیر کی مخالفت کرتے رہے۔ اس وجہ سے مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہوگیا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ عالم گیر کے ساتھ ہندوؤں کی اتنی مخالفت نہیں تھی، جتنی شیعہ ریاستوں کی تھی اور ہندوؤں کو بھی انہوں نے مخالفت پر آمادہ کیا تھا۔

(۷) حضرت مولانا صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ میں دیوبند سے فارغ ہو کر امروٹ

شریف میں آ کر رہا۔ اس وقت ایسے طالب علم میرے پاس آتے جن کے پچھلے اساتذہ جمعہ کی نماز کے بعد اخر ظہر (احتیاط الظہر) پڑھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے آخر ظہر کے بارے میں پوچھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے دیوبندی اساتذہ اور سندھ کے مرشدین جو حنفی مذہب کے پابند تھے وہ آخر ظہر (احتیاط الظہر) نہیں پڑھتے تھے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ تھا کہ دیوبندی اساتذہ بڑے شہروں میں جمعہ جائز کہہ کر وہاں جمعہ کا فرض آخر ظہر کے سوا ادا کرتے تھے اور چھوٹے گاوؤں قصبوں میں وہ قیام جمعہ کے قائل ہی نہ تھے، اس لیے ظہر کی نماز پڑھتے تھے۔ اور سندھ کے مرشد حضرات راشدیہ خاندان خلفاء (یعنی بھرچونڈی، دین پور اور امروٹ شریف کے بزرگ) قصبوں اور چھوٹے گاوؤں میں بھی جمعہ ادا کرتے تھے اور حنفی مذہب کے مکمل پابند تھے۔ میں نے حنفی مذہب کو سامنے رکھ کر طلبہ کی استدعا پر ایک تحریر لکھی اور سندھ کے اس عالم کو پہنچائی گئی جو آخر ظہر کا سخت قائل تھا۔ اس نے بھی میری تحریر کا لمبا چوڑا جواب لکھا۔ لیکن پھر میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کا جواب لکھوں۔ اگرچہ حنفی فقہا نے قیام جمعہ کے لیے جو شرائط مقرر کیے ہیں ان کی تحقیق کرتا رہا۔ آخر مولانا محمد قاسم قدس سرہ (بانی مدرسہ دارالعلوم دیوبند) کی ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی بنیادی شرط صرف مسلمان بادشاہ یا اس کے مقرر کیے ہوئے حاکم کا ہونا ہے۔ اگر ایسا ہو تو وہ شہر قصبہ اور گاوں میں جہاں چاہے نماز کرا سکتا ہے اس کے بعد ایک دفعہ حضرت صاحب امروٹ شریف (حضرت مولانا تاج محمود صاحب قدس سرہ متوفی ۵۔ نومبر ۱۹۲۹) کے ساتھ شکار پور میں مرحوم آغا میر علوی کی دعوت پر جانا پڑا۔ وہاں فقہ حنفی کی بڑے عالم ابو زید دابوسی کی کتاب "الاسرار" کا ایک قلمی نسخہ بہ طور ہدیہ مل گیا۔ ابو زید ہدایہ کے مصنف کے اساتذہ کا بھی استاذ ہے۔) اس نے بھی شرائط قیام جمعہ میں وہی بات لکھی تھی۔ جو حضرت مولانا محمد قاسمؒ لکھ چکے ہیں، جس کے بعد اطمینان قلب ہوا اور ہمارے مرشدین جو قصبوں میں جمعے کی نماز کے جواز کے قائل تھے۔ اس کے لیے بھی دلیل مل گئی۔

(مشہور ہے کہ صوفیہ صاحب حال ہوتے ہیں صاحب قال نہیں ہوتے ۔ ظاہر میں اگرچہ حنفی مذہب کے مطابق قصبوں اور گاؤں میں نماز جمعہ کے جواز کی دلیل نہیں تھی، لیکن ان کے اندر والا کہہ رہا تھا کہ گاؤں میں نماز جمعہ ضرور ادا کی جانی چاہیے اور اس پر ایک عالم نے حنفی مذہب کے مطابق دلیل بھی ڈھونڈھ نکالی ۔ اس طرح صوفیہ کا حال علماء کے قال کے عین مطابق ہو گیا ۔)

حضرت مولانا سندھی صاحب نے اس سلسلے میں مزید فرمایا کہ حضرت مرشد صاحب (یعنی خلیفہ مولانا غلام محمد صاحب دین پوری رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ نماز جمعہ کے مسئلے پر ایک رسالہ لکھا جائے جس کے مطابق دیہات میں بھی جمعہ جائز ہو سکے اور دلائل حنفی فقہ کے مطابق ہوں ۔ اس حکم کی تعمیل میں ایک رسالہ بھی، اردو ترجمہ مرتب کیا گیا جو لاہور سے چھپ کر شائع ہوا ۔

نوٹ : حنفی مذہب کے مطابق جمعہ کی بنیادی شرط مسلمان بادشاہ یا امیر کا ہونا ہے ۔ ان کی موجودگی میں کوئی بھی قصبہ یا گاؤں "مصر" ہو سکتا ہے ۔ حنفی مذہب کی ظاہر روایت کے مطابق "مصر" اسی شہر کو کہا جاتا ہے ، جس شہر میں امیر یا قاضی موجود ہو ۔ اس کے بعد حنفی مذہب کے علما نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اگر مسلمان حاکم یا ان کا قائم مقام کسی جگہ موجود نہ ہو ۔ جیسے ہندوستان کی حالت ہے تو اس حالت میں مسلمان کسی بھی آدمی کو اپنا امام یا پیشوا مقرر کر کے اس کے پیچھے جمعہ ادا کر سکتے ہیں اس کے بعد آخر ظہر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

مولانا صاحب مدظلہ کا فرمانا تھا کہ ہمارے مرشد اپنے اپنے گاؤں میں بااثر ہوا کرتے تھے اور گاؤں والے ان کے تمام احکام بہ ادب قبول کرتے تھے وہ اپنے قصبوں اور گاؤں کے پیشوا ہوتے تھے ۔ ان کو پورا حق تھا کہ حنفی مذہب کے اصول شرط کے مطابق دیہات میں بغیر کسی شک و شبہ کے جمعہ پڑھائیں اور آخر جمعہ (احتیاط الظہر) کو چھوڑ دیں ۔

(۸) حضرت مولانا صاحب مدظلہ نے ایک دفعہ قرآن کا درس دیتے ہوئے فرمایا کہ نماز و زکوٰۃ اصولی طور پر مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ زکوٰۃ کے معنی قانون کی اصطلاح میں یہ ہے کہ جو کچھ ہو وہ سب دے دیا جائے یعنی جماعت بندی کے لیے سب کچھ اپنے ساتھیوں پر خرچ کر دیا جائے اور مکہ میں ایسا ہی کیا جاتا تھا اور قرآنی احکام کو جاری کرنے والی پارٹی مکہ ہی میں قائم ہو گئی تھی۔ جس نے مدینہ میں آکر سرعام عملی کام شروع کر دیا۔ مدینہ میں زکوٰۃ کا جو نصاب یا مقدار مقرر ہوئی، وہ قانونی لحاظ سے تھی اور سلطنت کے کام چلانے کے لیے ایک مقررہ نصاب یا مقدار کے مطابق ٹیکس لینا ضروری تھا۔ ورنہ بنیادی طور پر زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کمایا جائے وہ خرچ کر دیا جائے بعد میں اپنے بچوں پر خرچ کرنا چاہیے اور دوسرے حق داروں اور مسکین مسلمانوں پر۔

(۹) ایک دفعہ حضرت مولانا صاحب نے فرمایا کہ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حکم ہے کہ "شاورھم فی الامر" یعنی اپنے ساتھیوں سے حکومت کے معاملات میں مشورہ کرتے رہو۔ مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ حضورؐ کے لیے صحابہ کرام سے مشورہ کرنا ضروری تھا یا نہیں؟ اس میں انہوں نے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، لیکن ابوبکر جصاص حنفی نے "احکام القرآن" میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیاوی معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ کرنا واجب تھا اور کوئی بھی دنیاوی کام ان کے مشورے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن پر عمل کرنے کا زمانہ صرف حضورؐ کی وفات پر ختم نہیں ہوا، بلکہ مہاجرین و انصار پر مشتمل مرکزی پارٹی قائم ہو چکی تھی، جس سے تمام ظاہری کاموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ لینا فرض تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی وہ پارٹی کام چلاتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ کام خلافت راشدہ کے زمانے میں حضرت عثمان کی شہادت کے وقت تک پورا ہو گیا۔

مولانا صاحب نے مزید فرمایا کہ اس زمانے میں اگرچہ شخصی بادشاہتوں کا دور ختم ہو چکا ہے، لیکن پہلے جو بڑے بڑے بادشاہ شخصی سلطنتیں چلاتے تھے۔ ان کو بھی مشورے کے لیے ایک پارٹی کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک طرف تو علماء ہی ان کے وزیر ہوتے تھے، جن کے مشورے پر سلطنتیں چلتی تھیں اور دوسری طرف آپ تاریخ پر غور کریں گے تو آپ کو تمام بادشاہوں کے ساتھ صوفی بزرگوں کا وجود نظر آتے گا۔

(توحید، کراچی جون ۱۹۴۳ء)

○ ترجمہ ثناء اللہ سومرو

ہندوستان ۔۔۔۔ اسلام کی نظر میں

ہندوستان کی اسلامی وطنی حیثیت پر " ہندوستان اسلام کی نظر میں" کے عنوان سے حضرت مولانا سندھیؒ کے ایما پر مولانا وفائی مرحوم نے ایک کتاب سندھی زبان میں تالیف کی تھی۔ یہ مختصر تحریر اسی کتاب کا " دیباچہ " ہے۔ جس کا ترجمہ عزیزم ثناء اللہ سومرو نے کر دیا ہے۔ یہ کتاب ابھی تک مخطوطے کی شکل میں ہے۔
(ا۔س)

۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ گاڑی کھاتہ کراچی میں میری رہائش تھی۔ ایک روز میں اپنے کمرے میں تالا لگا کر نکلا ہی تھا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی تشریف لے آئے۔ میں اگرچہ موجود نہ تھا لیکن مولانا مجھے نہ پا کر واپس نہ ہوتے بلکہ سیڑھیوں پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ادھر میں نے ایک ایسی باطنی کشش محسوس کی کہ لوٹ پڑا۔ رہائش گاہ پر واپس پہنچا تو مولانا کو منتظر پایا۔ میں نے کمرے کا تالا کھولا اور مولانا کو اندر لے آیا۔

حضرت مولانا اندر تشریف لائے اور چارپائی پر لیٹ گئے۔ نواب صدیق حسن خان قنوجی (بھوپالی) کی کتاب " ہدایت السائل " سرہانے رکھی تھی، مولانا اسے دیکھنے لگے۔ سب سے پہلے جس مضمون پر مولانا کی نظر پڑی، وہ اسلامی نقطہ نظر سے ہندوستان کی حیثیت اور توصیف میں تھا۔ مولانا نے ارشاد فرمایا:

آپ نے یہ مضمون دیکھا ہے؟

جی ہاں!

ہاں! اس قسم کے مضامین سندھی میں ترجمہ ہونے چاہییں۔ تاکہ مسلمانوں کو یقین ہو کہ ہندوستان واقعی ہمارا اسلامی وطن ہے۔ میں نے مولانا کی بات کی تائید کی۔

۱۹۴۷ء کے شروع میں، میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، مضمون لکھنا شروع کیا۔ میں لکھتا رہا، مضمون بڑھتا رہا، تاآں کہ مضمون ایک مضمون کی حد سے بڑھ کر ایک کتاب یا مستقل رسالے کی ضخامت تک پہنچ گیا اور مضمون ختم کیا تو ملک کی تقسیم عمل میں آچکی تھی۔ میرے لیے تو مولانا کا ارشاد گویا کہ ان کی وصیت تھی الحمد للہ کہ پوری ہو گئی۔

آپ اس کتاب کو پڑھیں گے تو اس کی اہمیت اور قدر کا اندازہ ہو گا۔

فقیر دین محمد وفائی عفی عنہ

کراچی

مسلمانوں کو اس وقت کیا کرنا چاہیے؟

مسٹر علی خان ایم اے میرے ایک بہت پرانے اور مخلص دوست اور درد مند دل رکھنے والے ایک مسلمان ہیں۔ ۱۹۱۸ میں جب میں لاڑکانہ سے حضرت پیر عبدالقادر شاہ راشدی کی رفاقت میں الکاشف رسالہ نکالتا تھا تو محترم علی خان کے اس وقت بھی اصلاحی مضامین الکاشف میں شائع ہوتے تھے۔ علی خان نے ملازمت کے دوران میں بھی اپنی ساری توجہ سندھ کے مسلمانوں کی اصلاح میں صرف کی۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ مگر افسوس یہ ہے کہ سندھ کے مسلمانوں کی حالت بالکل دوسرے رنگ میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اسلام پر پابندی کے جتنے وعظ ہوتے ہیں، اس کا الٹا اثر نکلتا ہے۔ یورپین تہذیب اور مغربی تعلیم کی برکت سے سارا معاشرہ ایک دوسرا رنگ اختیار کرتا جارہا ہے اور وہی مثل صادق آرہی ہے کہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

دنیا میں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جو تحریکیں اٹھتی ہیں۔ ان کی بنیاد ہمیشہ سیاسی قوت اور اقتدار حاصل کرنے پر ہوتی ہے۔ گویا کہ ان کے نزدیک جب تک کوئی قوم ملکی اور سیاسی طاقت کی مالک نہیں بن جاتی، اس وقت تک وہ بالکل اس بات کی ذمہ دار نہیں کہ قرآن مجید کی کسی تعلیم پر عمل کرے۔ لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ غلام قومیں بھی قرآن مجید کے صرف اخلاقی پہلو پر عمل کرتی رہیں تو اس سے انہیں مجموعی طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ قرآن کا اصلی نقطہ جہاد یا انقلاب ہے۔ اس سے اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ

غافل رہ گیا تو وہ حکومت کا مالک ہو کر بھی قرآن کی بنیادی بات کو لوگوں تک کیسے پہنچا سکے گا؟

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے ارشادات کے مطابق قرآن ایک انقلابی کتاب ہے۔ جب تک کسی آدمی کے ذہن پر قرآن پر عمل کرتے وقت انقلاب کا نقطہ موجود نہ ہو گا، اس وقت تک وہ قرآن مجید کو صحیح رنگ میں سمجھ نہ سکے گا۔ اس انقلابی تحریک کو روکنے کے لیے کبھی نماز کی تحریک شروع کرتے ہیں، کبھی سیرت النبی کے جلسے بلاتے ہیں اور کبھی کوئی دوسری چیز مذہب کے نام پر پیش کر کے مسلمانوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کی تمام فکری اور عملی صلاحیتیں ان میں صرف ہوتی رہیں اور وہ قرآن حکیم کے اصلی مقصد اور انقلاب کے راستے سے ہٹ جاتی ہیں۔

قرآن شریف میں دنیاوی زندگی کا پورا دستور العمل ہے۔ مگر جس جماعت نے شروع میں اس پر عمل کیا۔ انقلابی جماعت تھی، جس کی بنیاد مکہ شریف میں پڑی تھی اور بعد میں مدینہ شریف میں اس نے اپنا مرکز انقلاب بنایا تھا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے نزدیک حضرت امام ولی اللہ دہلوی کی فکر کے مطابق قرآن مجید کی اس انقلابی جماعت کا پہلا دور خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد زمانے کی تبدیلی اور اسلامی تحریک کی بڑھتی ہوئی حالت کے مطابق وہ جماعت مختلف صورتوں میں پھیلتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ انٹرنیشنل یا بین الاقوامی پوزیشن اختیار کر لیتی ہے۔ دمشق، بغداد، بخارا، غزنی، دہلی کے مراکز اسلامی اپنی جدا جدا شکلوں میں اسی تحریک کے مظاہر ہیں۔ اگرچہ ان میں پہلے تین خلفائے راشدہ کی خلافت کا ہو بہو اور بالکل ویسا ہی نقشہ نہیں ملتا۔ مگر ان زمانوں میں بھی اسلامی حکومتوں کا اصل مقصد آسمانی ہدایت کے اصولوں کو رائج کرنا تھا۔ وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام انجام دیتی تھیں اور عدل و انصاف کے مطابق فیصلے کرتیں اور معاملات کو نمٹاتی تھیں۔

یہ قرآن مجید کی تعلیم کے بلند ترین اصول تھے۔

امام عبید اللہ سندھی کا ارشاد ہے کہ قرآن شریف نے جو سوسائٹی اوائل عہد اسلامی میں قائم کی تھی اس کے اصول کیا تھے اور معاملات کیسے نجام پاتے تھے۔ انہیں اگر ان کی صحیح شکل میں دیکھنا ہو تو وہ موطا امام مالک میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مؤطا میں صرف اہل مدینہ کی روایات ہیں اور اکثر وہ چیزیں ہیں جو حضرت عثمان کی خلافت پر ختم ہوتی ہے۔

حضرت امام مالک مدینے کے باشندے تھے اور تین خلفائے راشدہ نے اپنی خلافت کا زمانہ بھی مدینہ منورہ میں گزارا تھا۔ تینوں خلفائے کرام اور ان کے ساتھی ؓ ہر معاملے میں اور ہر وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، ان سے جو کچھ قول یا فعل صادر ہوئے، وہ کتاب موطا امام مالک میں محفوظ ہیں۔ باقی رہیں حدیث کی دوسری کتابیں تو وہ موطا کی شاہد یا شرح ہیں۔ حضرت مولانا سندھی کا ارشاد ہے کہ اہل سنت جماعت کے چاروں مذاہب کا سرچشمہ موطا امام مالک ہے۔ اس لیے کہ امام ابو حنیفہ کے مذہب کے مرتب امام محمد امام مالک کے شاگرد ہیں۔ قاضی ابو یوسف نے بھی اس سرچشمے سے فیض حاصل کیا ہے اور امام احمد بن حنبل امام اہل سنت امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ اس طرح تمام مذاہب فقہیہ کا حقیقی مآخذ موطا بنتی ہے۔ ان مذاہب میں جو اختلافات ہیں، وہ ممالک اور لوگوں کے مختلف طبائع کے مطابق معمولی اور فروعی اختلافات ہیں نہ کہ بنیادی، اصولی طور پر سب یکساں ہیں۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے دنیا میں پھیلنے کے بعد وہ جہاں بھی پہنچے، ان کے سامنے قرآن اور اس کی تعلیمات و افکار کی عملی شکل موطا امام مالک رہی۔ اس کے بعد نئے حالات و تغیرات کے مطابق جتنے بھی قانون (فقہ کے مسائل)، وضع کیے گئے وہ انہی دونوں اصولوں کے مطابق ہوتے۔

اس لیے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی تشریح کے مطابق ہمیں حضرت

اورنگزیب عالم گیر کے دور حکومت میں دہلی کو مدینہ شریف کے دور اول سے جوڑنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی انقلابی تعلیم کے ذریعے جو سوسائٹی مدینہ منورہ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے کام کو مسلمان آخر وقت تک ایک خاص انداز سے ادا کرتے رہے اور قرآن حکیم کی اعلیٰ تعلیمات اور بلند ترین اصولوں کو اپنے اپنے خاص دائروں (حکومتوں) میں جاری کرتے رہے۔

(توحید، کراچی۔ جنوری فروری ۱۹۴۵ء)

○ ترجمہ شیر اللہ سومرو

ملک کا دفاع کیسے ہو سکتا ہے؟

مولانا دین محمد وفائی کا یہ ایک اداریہ ہے جو روزنامہ آزاد کراچی کی اشاعت مورخہ ۲۵۔ جولائی ۱۹۴۶ء کو شائع ہوا تھا۔ (ا۔ س)

ہندوستان آج کل ایک خاص سیاسی عمل سے گزر رہا ہے۔ حالات کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ اپنے اختیارات اہل ملک کے حوالے کر دینا اور اقتدار سے الگ ہو جانا چاہتا ہے۔ جد وجہد آزادی کا مقدس سفر استقلال وطن کی منزل پر پہنچنے والا ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں جب برٹش حکومت ملک کا اقتدار ملک کے باشندوں کو سپرد کر کے ہمیشہ کے لیے اس ملک سے چلی جائے گی۔

برطانوی وزارتی مشن نے اقتدار کی منتقلی کے لیے اب تک جو باتیں کی ہیں ان میں اگرچہ مختلف جماعتیں شریک رہی ہیں۔ لیکن صاف نظر آتا ہے کہ اصل فریق کانگریس رہی ہے اور اصل معاہدہ کانگریس ہی سے ہے۔ ایک مرکزی اسمبلی یا متحدہ ہندوستان کی تجویز قبول کرنے سے آپ صاف طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ آئندہ ہندوستان کی تمام طاقت کانگریس کے قبضے میں آنے والی ہے اور کانگریس ہی مرکز کی طاقت بن کر پنڈت جواہر لال نہرو کے بقول 'ہندوستان پر راج کرے گی۔'

اس حالت میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اس پر بھی کچھ غور کرنا چاہیے۔ اس لادینی غلبے اور کانگریس کی طاقت میں آنے کے بعد مسلمان اپنا دین

اور مذہب کیسے بچا سکتے ہیں؟ کیا اس پر کسی لیگی یا غیر لیگی مسلمان نے غور کیا ہے؟

آج ہندو قوم پورے طور پر منظم اور مضبوط صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ ان کے پاس مہاتما گاندھی جیسی ہندو دھرم کی جیتی جاگتی ہستی موجود ہے۔ لیکن کیا مسلمانوں کے پاس بھی دین اسلام کا کوئی زندہ وجود ہے؟ ان کے پاس کوئی ایسا سیاسی لیڈر ہے، جس کو دیکھنے سے صدیق اکبرؓ یا فاروق اعظم کی یاد آ جاتے؟ اور جس کی عملی زندگی ہندوستان میں دفاع اسلام کے لیے کار آمد ہو سکے؟ آپ اس سوال پر غور کریں۔ ایک بار نہیں سو دفعہ غور کریں۔ آپ کو نفی کے سوا کوئی اور جواب نہیں ملے گا۔

ایسے نازک حالات میں مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ وہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے پروگرام پر چل کر ہندوستان میں اپنے دین کا دفاع کریں اور اس طرح اپنی ہستی کو قائم رکھ سکیں۔

" آزاد" ۴۴ء۔ جولائی کی اشاعت میں محترم مسٹر محمد امین خان کھوسو کا حضرت مولانا سندھی کی تعلیمات پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں کھوسو صاحب موصوف نے ہندوستان میں دفاع دین کے لیے دو جملوں میں حضرت مولانا کی تعلیم کو بیان کر دیا ہے کہ دین کے لیے دنیا کا تمام ساز و سامان حاصل کریں اور دین کے لیے کانگریس میں شریک ہو جائیں آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرنا چاہیے، جو دفاع دین کے تصور اور سعی سے خالی ہو۔

محترم محمد امین خان حضرت مولانا سندھی کے ان ساتھیوں اور رفیقوں میں سے ہیں جو ان کے محرم راز تھے۔ مولانا کو ان سے بے پناہ محبت اور الفت تھی۔ اگر محمد امین خان کو حضرت مولانا کے سب تلامذہ اور عقیدت مندوں میں سب سے بلند مقام شمار کیا جائے تو حق ہے۔ انہوں نے حضرت مولانا کی تعلیمات کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ موجودہ زمانے میں مولانا کے ارشادات اور ان کی تعلیمات کا اگر انہیں صحیح طور پر شروع کرنے والا سمجھا جائے اور محرم اسرار کہا جائے تو بالکل درست اور بجا ہو گا۔

حضرت مولانا کا یہ رازداں اور محرم اسرار کہتا ہے کہ مولانا کے نزدیک کانگریس میں داخل ہونا، دین کی سیاسی خدمت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ مسلمانان سندھ کو وہ سیاست میں کانگریس کا مالک بنانا چاہتے ہیں۔ کانگریس کا مالک بننے کے لیے بڑے تمیز اور عقل کی ضرورت ہے"۔

وہ آگے چل کر فرماتے ہیں:

> "مسلمانان سندھ کے لیے عملی پروگرام یہ ہے کہ وہ کانگریس میں داخل ہو جائیں۔ یہ ایک بڑی حکمت عملی ہے۔ مسلمانوں کو کانگریس میں داخل کریں اور انہیں یہ حکمت عملی سکھائیں۔ آپ اگر عبید اللّہی پروگرام سمجھنا چاہتے ہیں تو پھر لیگ سے آپ کی دشمنی نہیں ہونی چاہیے "لیگ" لیگ ہے۔ آپ اس کو برا کیوں کہیں؟ آپ اپنا کام کریں"۔

مطلب یہ ہے کہ لیگ جس طرز و صورت میں ہے، اس کو اس کی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں، لیکن موجودہ حالات کا ایک ہی تقاضا ہے کہ آج تمام مسلمانان سندھ حضرت مولانا کے دینی تصور کو ذہن میں بٹھاتے ہوئے کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ ہر گاؤں میں ایسی کمیٹیاں قائم کریں اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ممبر بنائے جائیں۔ کیونکہ یہاں کا مسلمان جب تک ہندوستان کی صحیح سیاست میں حصہ نہیں لے گا تب تک وہ ہندوستان میں اپنی سیاسی قوت سے نہ سیاسی مفاد حاصل کر سکے گا نہ دین کے دفاع کا کوئی کام انجام دے سکے گا۔

حضرت مولانا سندھی کی دعوت کے مطابق کانگریس میں شرکت کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ مسلمان کانگریس میں اس کا پچھلا بن کر رہیں اور اپنی حقیقت اور اصولوں کو بھول جائیں۔ حضرت مولانا نے اپنے خطبوں میں بار بار ارشاد فرمایا ہے کہ ہم کانگریس میں اپنی مستقل پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔ اسی مستقل پارٹی کی شرح محمد امین خان نے اس طرح

فرماتی ہے کہ ان کانگریس کمیٹیوں میں مرکزی شخصیت حضرت مولانا سندھی کی ہے ۔ وہ کانگریس کمیٹیاں بلاواسطہ سندھ ساگر پارٹی کی تابع رہیں گی۔ اس کے علاوہ کانگریس کمیٹیوں کو ہم اپنے ذریعے سے باقاعدہ کراسکتے ہیں اور ان کا صوباتی کانگریس کمیٹی سے الحاق یا اس سے جوڑنے کا کام ہمارے ذمے ہے۔

پورے یقین اور ایمان کے ساتھ ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے دفاع کے دوسرے سب دروازے بند ہو چکے ہیں ۔ ماسوا عبید اللہی پروگرام اور عبید اللہی اسکیم کے دروازے کے ! اس کے ذریعے مسلمان اپنے آپ کو اس ملک کا مالک تصور کرکے ۔ اس ملک میں پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہ کر، دین و دنیا کی خدمت کر سکتا ہے اور ہر کام سندھ سے شروع کرنا ہے اور شروع ہو چکا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ رفتہ رفتہ اس کام کا دائرہ تمام ہندوستان تک وسیع ہو جائے گا اور اس راہ میں جو مشکلات حائل ہیں، وہ سب رفع ہو جائیں گی ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔

○ ترجمہ ثناء اللہ سومرو اصلاح و نظر ثانی ڈاکٹر ابو سلمان سندھی

ضمیمه

ضمیمہ :

سندھ ساگر پارٹی کے اصول و مقاصد

اس کتاب کے متعدد مضامین میں ”سندھ ساگر پارٹی“ کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اس کی تنظیمی نوعیت اور اس کے اغراض و مقاصد کی تفصیل کا پتا نہیں چلتا۔ قارئین کرام کے مطالعے میں یقیناً تشنگی باقی رہ جائے گی، اگر اس پارٹی کا ضروری تعارف نہ کرا دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے کئی طریقوں میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی ایک تحریر شامل کر دی جائے۔ اتفاق سے ہمیں مولانا عزیز اللہ جروار صاحب کی عنایت سے حضرت مولانا سندھی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر کا مسودہ مولانا ہی کے قلم سے دستیاب ہو گیا۔ یہ تحریر پہلی بار اس کتاب میں اشاعت کے لیے حوالے کی جا رہی ہے۔ اس کی شمولیت سے نہ صرف پیش نظر مقصد بہ خوبی حاصل ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ فائدہ بھی ہے کہ۔

۱۔ مولانا سندھی مرحوم کا ایک علمی اثر محفوظ ہو جائے گا اور

۲۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس نام کی کسی آج کی پارٹی سے مولانا سندھی کی پارٹی الگ، زیادہ بلند خیالات اور وسیع حلقہ اثر کی حامل پارٹی تھی۔

حضرت مولانا سندھی مرحوم نے پارٹی کے اصول و مقاصد اور پروگرام کا یہ مسودہ ۱۴ - نومبر ۱۹۳۸ء کو مکہ مکرمہ میں قیام کے زمانے میں ترتیب دیا تھا۔

(ابو سلمان سندھی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبہ للمتقین وصلی اللہ علی سیدنا محمد والہ وصحبہ وبارک وسلم، امابعد۔

یہ چند اصول ہیں جو ایک ہندوستانی مسافر مستقبل ہند کے متعلق ارض حرم میں بیٹھ کر تجویز کرتا ہے۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل

(۱) ہماری تمام کوششوں کا مرجع یہ ہے کہ ہم اپنے وطن میں اعلیٰ اصول ترقی پر ایک نیشنل پارٹی قائم کرنے کے لیئے راستہ صاف کریں۔

(الف) اس پارٹی کا نام "سندھ ساگر پارٹی" ہو گا۔

(ب) اس پارٹی کا میدان عمل نارتھ ویسٹرن انڈیا ہے، جس کی مشرقی اور جنوبی حد اس خط سے متعین ہوتی (ہے)، جو جھیل مانسرور سے شروع ہو کر الہ آباد سے گزرتا ہوا نربدا سے جا ملے اور اسی کے متوازی بحر عرب پر ختم ہو۔

تشریح: یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دریائے سندھ مانسرور سے نکلتا ہے اور بحر عرب میں گرتا ہے۔

(۲) اس پارٹی کے میدان عمل کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(الف) پہلا حصہ آج کا صوبہ سندھ ہے، جس کا دارالصدر کراچی (جو تاریخی دیبل کا دوسرا نام ہے) اس پارٹی کا مرکز ہو گا۔

(ب) دوسرا حصہ وہ ممالک ہیں جن کے سرچشموں کا پانی دریائے سندھ میں آتا ہے ہزار سال پہلے یہ سارا علاقہ کشمیر و کابل و غزنی سمیت سندھ کہلاتا تھا جس کا ثبوت عربی تاریخوں میں ملتا ہے۔ ہم لاہور کو اس حصہ کا مرکز مانتے ہیں۔

(ج) تیسرا حصہ وہ متصلہ ممالک ہیں جن کا سندھ ساگر میں شامل رہنا اہم سیاسی مصالح کے اعتبار سے ضروری ہے۔ اس حصہ کا مرکز دہلی ہے۔ دہلی تمام سندھ

ساگر کے لیے انٹرنیشنل مرکز ہو گا۔

تشریح: پارٹی کا سیاسی حلقہ مشرق کی طرف جمنا اور راجستھان پر ختم ہوتا ہے۔ مانسرور نربدا خط دہلی کے لیے اردو کے لسانی۔ حلقے کا تعین کرتا ہے۔

(۳) اس پارٹی کی تشکیل اقتصادی اصول پر ہو گی۔ متوسط درجہ کے ترقی یافتہ انسان کی ضروریات زندگی کے معیار پر اپنے سیاسی حلقہ اثر کے ہر فرد کے لیے اس کی ضروریات مہیا کرنا پارٹی کا اہم مقصد ہے

(الف) پارٹی قوموں کی سیاسی نمائندگی کے لیے ان کی تقسیم صنعتی اقتصادی اصول پر کرے گی۔ مشترک المفاد اصناف کے حلقے علیحدہ علیحدہ بنائے جائیں گے مثلاً: (۱) سرمایہ دار (۲) کاریگر، مزدور (۳) زمیندار (۴) کاشتکار

(ب) سیاسی نظام ایسا منضبط کر دیا جائے گا کہ ایک حلقہ دوسرے حلقہ پر تعدی نہیں کر سکے گا۔ پارٹی تمام اصناف کے مفاد کی حفاظت کرے گی۔

(۴) سندھ ساگر پارٹی ہر ایک مذہب کو پوری آزادی دیتی ہے اور ہر ایک مذہب کے مقدسات کا احترام کرتی ہے۔

(الف) پارٹی ہر ایک مذہب کی نمائندگی اس مذہب کے اصلاح پسند ترقی کن فرقہ کے لیے تسلیم کرے گی۔

(ب) متصادم رسوم مذاہب کے حدود مقرر کرنے کا حق اس کانفرنس کو حاصل ہو گا۔ جو تسلیم شدہ مذہبی فرقوں کے اشتراک سے منعقد ہو گی اگر وہ کانفرنس فیصلہ نہ کر سکے تو سندھ ساگر پارٹی کی مرکزی جماعت نیشنل کانگریس کا فیصلہ واجب التسلیم ہو گا۔

(۵) سندھ ساگر پارٹی حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی کے ہندوستانی فلسفہ کو اپنا عقلی اساسی اصول قرار دیتی ہے۔ پارٹی کی مرکزی جماعت کی تشکیل اسی ذہنیت کے ممبروں سے ہو گی۔ یعنی مختلف ذہنیات کے ممثلین کو اس کی مرکزی مجلس میں شرکت کا حق نہیں دیا

جائے گا۔

(الف) یہ فلسفہ ہندوستانی ذہنیت کی تدریجی ترقی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں بیرونی ہند و فلاسفی کے تمام فوری اصول تسلیم شدہ ہیں اور اس کے متوازی اسلامی دور کے ذہنی ارتقا کی تکمیلی شکل موجود ہے۔ اس میں فلسفہ کے دو مختلف اسکولوں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا پرانا تاریخی تخالف دور کر دیا گیا ہے۔

(ب) اس کے فلسفہ الہیات کی تعلیم ریاضی کی مثالوں سے واضح ہو سکتی ہے جس کا نمونہ اس فلسفہ کے تیسرے شارح مولانا محمد قاسم موسس دارالعلوم دیوبند کی تالیفات میں موجود ہے۔

تشریح: اس فلسفہ کے پہلے شارح امام عبدالعزیز دہلوی اور دوسرے شارح مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی ہیں۔

(ج) اس کا اجتماعی فلسفہ ایسا مکمل ہے کہ انسانی عقل آج تک اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

(د) اس فلسفہ سے تمام مذاہب عالم کی عقلی تشریح و تطبیق ہو جاتی ہے۔

(۶) اس پارٹی کے آخری فیصلہ کن سیاسی اجتماع کا نام سندھ ساگر نیشنل کانگریس ہو گا۔ اس کے تمام فیصلے پارٹی کے لیے قطعی ہوں گے۔

(الف) اس کانگریس میں شرکت کا حق ہر ایک ممبر کو فقط اس کے اقتصادی صنفی حلقہ کی نمائندگی کے اصول پر حاصل ہو گا۔ کسی مذہبی جماعت کو مذہبی حیثیت سے نمائندگی نہیں دی جائے گی۔

(ب) سندھ ساگر پارٹی آل انڈیا نیشنل کانگریس کو آل انڈیا انٹر نیشنل کانگریس کے درجہ پر مانتی ہے۔

تشریح: پورا ہندوستان ایک براعظم ہے۔ مختلف اقوام و ممالک کا مجموعہ۔ اگر روس کو علیحدہ فرض کیا جائے تو رقبہ اور آبادی میں یورپ سے متقارب

ہے۔ اس لیے کسی آل انڈیا سیاسی مجمع کو نیشنل مجمع ماننا ایک اصطلاحی غلطی ہے۔ پورے ہندوستان کے انٹرنیشنل فیڈریشن میں سندھ ساگر پارٹی کا سیاسی حلقہ اثر اور اس کی نیشنل کانگریس ایک تسلیم شدہ وحدت اور ایک اکائی مانی جائے گی۔

(۷) سندھ ساگر پارٹی کے عمومی حلقہ اثر میں ہر فرد کے لیے اس کی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا ضروری ہے۔

(الف) میدان عمل کے پہلے حصہ میں سندھی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ حکومت سندھ کی اس تجویز کو پارٹی تسلیم کرتی ہے اور بالغوں کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لیے اسے منقطع ابجد میں لکھنا تجویز کرتی ہے۔

(ب) رسم الخط کے بارے میں ہندوستانی قوموں کے نزاع وجدال کو ختم کرنے کے لیے پارٹی ہر فرد کے لیے ضروری قرار دیتی ہے کہ ہندی کیرکٹر اور رومن کیرکٹر میں بھی سندھی لکھنا سیکھے۔

(ج) پارٹی اپنے حلقہ اثر کے دوسرے دو حصوں میں بھی مقامی زبان کو تسلیم کرتی ہے اور اسے ان تین رسم الخط میں لکھنا ضروری قرار دیتی ہے۔

تشریح: پنجابی کے لیے ہندی کیریکٹر، گورمکھی اور اردو کے لیے ناگری۔

(۸) پارٹی کے حلقہ اثر عمومی میں ایسی اقوام بستی ہیں، جن کے عظیم الشان تاریخی انٹرنیشنل اجتماع نے اردو جیسی شستہ اور ترقی کن زبان یادگار چھوڑی ہے۔ اس اجتماع میں ہندی، فارسی، ترکی قومیں شریک تھیں۔ اور ہندوستان کے انٹرنیشنل اجتماع کے لیے مشترک زبان بننے کی پوری استعداد رکھتی ہے اسی لیے انگریزی حکومت نے اپنے پہلے دور میں اس (اردو، ہندوستانی) کو شمالی ہند کی بین الاقوامی زبان مان لیا تھا۔ دہلی اور کلکتہ اس کے مرکزی مرکز تھے۔ اس کے بعد دوسرے دور میں دہلی کے عوض لاہور کو مرکز بنایا اور دہلی کی دو یا تین شاخیں پہلے دور میں پیدا ہو چکی تھیں لکھنؤ، رام پور،

حیدر آباد، آخر میں حکومت انگریزی دہلی کی مرکزیت پیدا کر رہی تھی۔ پارٹی ہندوستان کی اس نادر خصوصیت "اردو، ہندوستانی" کی حفاظت اور ترقی ضروری سمجھتی ہے۔

(الف) پارٹی اسے اپنے عمومی حلقہ اثر کے لیے انٹرنیشنل زبان مانتی ہے۔

(ب) پارٹی کے حلقہ اثر کی مقامی زبانیں فقط ابتدائی اور وسطی درجہ تک تعلیم کا ذریعہ بہ مشکل بن سکتی ہیں۔ اس زمانہ میں "اردو، ہندوستانی" بطور زبان کے لازمی ہو گی اور جہاں مقامی زبان کی حد ختم ہوئی، تمام تعلیم اس "اردو، ہندوستانی" کے ذریعے دی جائے گی اور جامعہ ملیہ، دہلی اس طرح کی تعلیم کا مرکز ہو گی۔

(ج) اردو کی ترقی کے لیے پارٹی اپنے تعلیمی مرکزوں میں ان چار زبانوں کی تعلیم جاری رکھے گی: (۱) فارسی (۲) عربی (۳) ناگری (۴) انگریزی۔

(۹) ہند کے دوسرے حصوں سے ملنے کے لیے جہاں اردو بین الاقوامی فائدہ نہیں دے سکتی۔ ان ممالک ہند کے لیے پارٹی انگریزی زبان کو اپنی انٹرنیشنل زبان مانتی ہے۔

(الف) اور اس طرح بیرونی ممالک کے لیے بھی اسے اپنی بین الاقوامی زبان بناتی ہے۔

تشریح: انگریزی زبان تخمیناً دو سو برس سے ہند میں بالتدریج حکومت کر رہی ہے جنوبی ہند کے بعض حصے اسے اپنی زبان کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے اسے نیم ہندوستانی زبان کا درجہ دینا انصافاً و مصلحتاً ضروری ہے۔

(ب) پارٹی کے حلقہ اثر میں انگریزی زبان کی تعلیم ہر فرد کے لیے حسب المدارج ضروری ہے۔

تشریح: سندھ ساگر پارٹی اپنے پہلے دور میں مصلحت خارجیہ کے لیے انگریزی کو اول درجہ پر رکھے گی اور اردو، ہندوستانی کو دوسرے درجہ پر۔ اس

کے بعد دوسرے دور میں اردو ہندوستانی کو اول درجے پر رکھے گی اور انگریزی
کو دوسرے درجہ پر۔ مگر انگریزی کو اپنے حلقہ اثر سے نہ تو خارج کرے گی۔
نہ اس کی اہمیت کم کرے گی۔

(۱۰) سندھ ساگر پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی ہے۔ اس لیے
اس کا نصب العین وہی انڈین نیشنل کانگریس کا نصب العین ہے۔ یعنی پورے
ہندوستان کی کامل و مکمل آزادی اور استقلال۔

(الف) سندھ ساگر پارٹی آزادی حاصل کرنے میں اسلامی ممالک کی انفرادی ذمہ داری
کو مجموعی ہند کی ذمہ داری پر مقدم مانتی ہے۔

(ب) تکمیل آزادی کے دور میں سلطنت ہند کی مصلحت حربیہ اور مصلحت خارجیہ
پر بالتدریج جس قدر ہندوستانی قبضہ ہو گا۔ اس میں بھی پارٹی ممالک ہند کا
انفرادی حق پورے ہند کے حق پر مقدم قرار دیتی ہے۔

تشریح: اگر ہند کے جنوبی اور وسطی ممالک تحصیل آزادی میں تساہل
برتیں تو نارتھ ویسٹرن انڈیا کو اپنی پیش قدمی کو جاری رکھنا چاہیے۔ پارٹی
آنکھوں دیکھی بات کی طرح یقین رکھتی ہے کہ بیرونی انقلاب کی لہریں پہلے
اسی حصہ سے ٹکرائیں گی۔ انقلاب اعلان جنگ کی شکل میں ہو یا تحریبی
پروپیگنڈا، اس لیے دوسرے حصوں کے پیچھے چلنا اپنی موت کے فیصلے پر
دستخط کرنے کے برابر ہے۔ اسی طرح سندھ ساگر پارٹی کے حلقہ اثر کی
مصلحت حربیہ اور خارجیہ پہلے سندھ ساگر نیشنل کانگریس کے قبضے میں ہوگی
اس کے بعد آل انڈیا نیشنل (یا انٹرنیشنل) کانگریس کے ہاتھ میں۔ کیوں کہ
ہم اپنا مستقبل وسطی اور جنوبی ممالک کے فیصلے پر نہیں چھوڑ سکتے۔

(ج) سندھ ساگر پارٹی فیصلہ کرتی ہے کہ کافی زمانے تک ہمیں برٹش کامن ویلتھ
کے اندر رہنا ہو گا۔ تاکہ باہمی سمجھوتہ سے حربیہ اور خارجیہ مصلحتوں پر قبضہ

کیا جاسکے۔

(د) سندھ ساگر پارٹی فیصلہ کرتی ہے کہ حربیہ اور خارجیہ پر قبضہ کرنے کے بعد بھی کافی زمانہ تک ہمیں برطانیہ کے ساتھ رہ کر اس کی دوستی سے استفادے کی ضرورت ہوگی۔

(ہ) سندھ ساگر پارٹی مستقل مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ہند کی آزادی پسند اور انقلابی جماعتیں عام نظر میں جس قدر برطانیہ کی محتاج نظر آتی ہیں۔ فی الحقیقت برطانیہ کو اس سے کہیں زیادہ ان ہندوستانی جماعتوں کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ اس لیے پارٹی کی نظر میں ناممکن نہیں کہ عدم تشدد کے اصول پر حزم واحتیاط سے عمل کرنے کا نتیجہ استقلال کامل نکل آئے۔ اس احتمال پر پارٹی نے عدم تشدد کا مسلک اپنے سیاسی پروگرام میں داخل کر لیا ہے۔ ہندوستان کے وسطی ممالک کی طرح ہم اسے ایک مذہبی عقیدہ نہیں مانتے۔

حسبی اللہ لا الہ الا اللہ علیہ توکلت و ھو رب العرش العظیم۔ و آخر دعوانا ان

الحمد للہ رب العالمین

تعلیقات ــــــ از ڈاکٹر ابو سلمان

اس مضمون میں بہت سی شخصیات کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ ان میں بعض سندھ کی تاریخی سیاسی شخصیات ہیں۔ ذیل میں ان کے بعض خصائص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

میاں ظہیر الحق دین پوری :

مولوی غلام محمد دین پوری کے صاحبزادہ محترم اور حضرت مولانا سندھی کے نواسے آج کل خان پور میں مقیم ہیں۔

مولوی عبدالمجید طالب علم :

یہ کند کوٹ (سندھ) کے مولانا عبدالمجید عابد، حضرت سندھی کے آخری دور کے شاگرد ہیں۔ ماشاء اللہ حیات ہیں۔

حکیم شمس الدین :

حیدر آباد (سندھ) کے ماہر و حاذق طبیب تھے۔ نوشہرو فیروز ضلع نواب شاہ سے تعلق تھا۔ سندھ کے مشہور سیاسی رہنما قاضی فضل اللہ کے بڑے بھائی تھے۔ ۱۹۲۰ سے سیاست سے دلچسپی تھی خلافت کمیٹی حیدر آباد کے جنرل سیکرٹری رہے تھے۔

شیخ عبدالمجید سندھی :

(۱۸۸۹ - ۱۹۷۸) ٹھٹھہ (سندھ) کے لیلا رام کے بیٹے، مشہور نو مسلم، سندھ کے قابل فخر فرزند شیخ عبدالمجید سندھی کے نام سے مشہور ہوتے۔ خلافت کمیٹی، کانگریس، مسلم لیگ سے وابستہ رہے تھے قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کو چھوڑ دیا تھا۔ کئی

دوسری پارٹیوں میں کام کیا تھا۔

مولانا قاری محمد طیب قاسمی:

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حافظ محمد احمد کے بیٹے۔ خود بھی مدت العمر مہتمم رہے۔ حافظ قاری اور عالم تھے۔ اور بے مثال خطیب بھی۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آگئے تھے لیکن ان کے خاندان ہی کے بعض نیازمندوں نے یہاں ان کے قدم جمنے نہ دیے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے ہندوستان واپس بلا لینے کے لیے درخواست کی۔ حضرت نے مولانا ابوالکلام آزاد سے کہہ کر انہیں ہندوستانی پاسپورٹ دلوا دیا اور دوبارہ انہیں دارالعلوم کی مسند اہتمام پر بٹھایا۔ آخر میں انہوں نے حضرت شیخ الاسلام کے اخلاف کے لیے بعض مسائل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۸۳ میں ان کا مولد دیوبند ہی ان کا مدفن بنا۔

خان بہادر حاجی مولا بخش:

ولادت (۱۹۰۵)، شکار پور کے مشہور آزاد خیال اور قوم پرور خاندان کے ایک فرد، اللہ بخش سومرو شہید کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے خاندان نے ملک کی تحریک آزادی سے لے کر آزادی کے بعد تک ملک کی تعمیر و ترقی کے ہر دور میں سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ اور آج بھی اس خاندان کے افراد سندھ اور ملک کی سیاست اور قومی خدمت کے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔

حافظ محمد صدیق (بھرچونڈی شریف والے):

(ف ۱۳۰۸ھ بہ عمر ۴۷ برس)، راشدی، جیلانی، نقشبندی سلسلے کے مشہور بزرگ۔ بھرچونڈی شریف کی عظیم خانقاہ طریقت کے بانی مبانی سید العارفین حافظ محمد صدیق رحمتہ اللہ علیہ۔

میر ہزار خاں:

انسپکٹر ریلوے پولیس روہڑی ۔ حضرت مولانا سندھی کے ایک عقیدت مند اور ارادت کیش۔

مولانا عزیز احمد:

ابن شیخ حبیب اللہ، برادر خورد مولانا احمد علی لاہوری ۔ حضرت سندھی کے شاگرد و جان نثار، کابل، روس، ترکی اور حجاز کی جلا وطنی کے زمانے میں مولانا سندھی کے ساتھ رہے۔ قرآن میں گہری نظر تھی۔ حجتہ اللہ البالغہ پڑھاتے تھے۔ انقلابی افکار و خیالات کے عبید اللہی سانچوں میں ڈھلے ہوتے تھے۔

پیر میاں عبداللہ:

(۱۲۸۳ھ --- ۱۳۴۶ھ)، بانی خانقاہ بھرچونڈی شریف کے بھتیجے اور پہلے سجادہ نشین۔ آج کل سجادہ نشین پیر عبدالرزاق صاحب ہیں۔

مولانا میاں غلام محمد دین پوری:

(۱۸۳۵ - ۱۹۳۶)، ابن سردار حاجی نور محمد خاں، موضع عالے خان شرقی ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے ۔ حضرت سید العارفین حافظ محمد صدیق کے خلیفہ اول خانقاہ طریقت اور مرکز انقلاب دین پور کے بانی۔ حضرت امام سندھی اپنی بیٹی کو انہی بزرگ کی تولیت میں دے گئے تھے اور فرما گئے تھے کہ بلوغ کے بعد کوئی مناسب رشتہ آئے تو اس کا عقد مسنون کر دیا جائے۔

مولانا محمد حسن منطقی:

یہ شاید مولانا احمد حسن کان پوری ہیں۔ مدرسۂ فیض عام کان پور کے صدر مدرس مشہور عالم دین تھے ندوۃ العلماء کے بانیوں میں ان کا نام بھی آیا ہے۔ اصلاً پنجاب کے رہنے والے تھے۔

مولانا محمود حسن:

(۱۸۵۱ء۔ ۱۹۲۰ء) ، ابن مولانا ذوالفقار علی دیو بندی ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد رشید اور علم و سیاست میں حضرت کے سچے جانشین ، ولی اللہی مدرسہ فکر کے مستقل امام ، مذہب و سیاست کے جامع حیثیات ، برصغیر ہند پاکستان کی مرکزی انقلابی شخصیت ، خود ایک مستقل سیاسی تحریک کے بانی ، مصنف اور قرآن حکیم کے مشہور مترجم و محشی ، مولانا عبید اللہ سندھی کے محبوب استاد ، سیاسی مربی اور رہنما ، حضرت مرحوم کی سیاسی شخصیت اور خدمات کے اعتراف میں ملت اسلامیہ ہند پاکستان نے انہیں شیخ الہند کا خطاب دے کر اپنی حق شناسی و حق پروری کا ثبوت دیا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز:

کراچی میں مولانا سندھی کے معالج

مولانا محمد صادق:

(۱۸۷۴ء۔ ۱۹۵۳ء) ابن مولانا عبداللہ۔ حضرت شیخ الہند کے شاگرد ، جمعیت الانصار دیو بند کے قیام کی کوششوں اور کاموں میں مولانا سندھی کے شریک ، عالم و مصلح اور سماجی و سیاسی خدمت گزار اور رہنما ، مسلمانوں کی اصلاح تعلیم و تربیت اور آزادی وطن کی تمام تحریکوں میں حصہ لیا ، مدرسہ مظہر العلوم (محلہ کھڈا۔ کراچی) کے مہتمم و شیخ الحدیث ، مولانا سندھی کے دوست معتمد اور ان کی تحریکات جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی ،

بیت الحکمت وغیرہ میں شریک و معاون جمعیت علمائے ہند کے قیام کے وقت سے لے کر زندگی کے آخری لمحوں تک جمعیت علمائے سندھ کے صدر رہے۔ سندھ میں آزاد خیال اور قوم پرور مسلمانوں کے سرخیل تھے۔

محمد امین خان کھوسو:

(۱۹۱۰ء۔ ۱۹۷۳ء)، ابن سردار حاجی عبدالعزیز خان کھوسو آف جیکب آباد۔ بلوچوں کے کھوسہ قبیلے کے سردار، علی گڑھ کے گریجویٹ۔ سندھ کے سماجی و سیاسی رہنما، ہاری کمیٹی اور کمیونسٹ پارٹی سندھ سے وابستہ رہے۔ بھرچونڈی شریف کے پیر عبدالرحمن سے بیعت تھے، مولانا عبیداللہ سندھی کے مرید و عاشق، ان کے سیاسی افکار کے والہ و شیدا۔۔ حضرت امام سندھی کی صحبت نے ان کی زندگی اور افکار و خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا اور وہ اشتراکی انقلابی کے بجائے مسلم انقلابی بن گئے تھے۔ ایک ضمنی انتخاب میں سندھ اسمبلی کے لیے کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ وہ اللہ بخش شہید کے قابل اعتماد دوستوں میں سے تھے۔

مولانا عبدالکریم:

حضرت مولانا سندھی کے خاص شاگردوں میں سے اور مولانا سے مکہ مکرمہ میں قرآن حکیم کا ترجمہ پڑھا تھا۔ وہ علامہ موسیٰ جار اللہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔

مولانا عبداللہ لغاری:

۱۲۸۸ھ (۲)۔ ۱۸۷۱ء تا ۱۹۵۸ء) مولانا عبید اللہ سندھی کے ابتدائی دور (دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا کے زمانے) کے شاگرد اور مدرسہ دارالرشاد کے مدرس۔ مکہ مکرمہ میں بھی ایک مدت تک قرآن پڑھتے رہے۔ حضرت امام کے امالی تفسیر کے جامع اور "مولانا سندھی کی سرگزشت کابل" کے مولف جامعہ سندھ کے قیام کے بعد ایک

عرصے تک اس کے شعبہ اسلامیات سے قرآنیات کے پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

فقیر محمد خان منگریو:

میر پور خاص کے ایک زمیندار اور مولانا سندھی کے عقیدت مند تھے۔

مولانا عبد القادر:

ابن مولوی خیر محمد خان اصلاً پنجاب کے رہنے والے تھے۔ سندھ کو وطن ثانی بنا لیا تھا۔ سانگھڑ میں آباد ہو گئے تھے۔ دار الرشاد پیر جھنڈا میں مولانا احمد علی لاہوری کے شریک درس اور مولانا سندھی کے شاگرد تھے۔ دار الرشاد میں مدرس ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں وہ اس کے مہتمم تھے۔

خان بہادر غلام محمد خان:

ابن خان بہادر محمد ہاشم وسان سانگھڑ کے زمیندار اور مولانا سندھی کے ارادت مند تھے۔

حکیم مولوی محمد معاذ:

ولادت ۱۸۹۶ء ابن حاجی محمد عارف پیر زادہ تعلقہ سکرنڈ، ضلع نواب شاہ (سندھ) کے رہنے والے تھے۔ طب کی تکمیل دہلی میں اور اسلامیات کی تکمیل دار العلوم دیو بند میں کی تھی۔ مولانا سندھی سے قرآن کا ترجمہ پڑھا تھا۔ ان کا خاندانی نام محمد پناہ تھا۔ مولانا سندھی نے ان کے والد کی اجازت سے نام تبدیل کر کے محمد معاذ کر دیا تھا۔ اس تبدیلی کے بعد بھی معنی وہی رہے تھے۔ قوم پرور خیالات رکھتے تھے۔ جمعیت علمائے ہند، کانگریس، ہاری تحریک، سندھ متحدہ محاذ سے ان کا تعلق رہا تھا۔ کئی بار جیل بھی گئے تھے۔ حکیم محمد معاذ اپنے زمانے کے ماہر اور حاذق طبیب تھے! نواب شاہ میں مسجد روڈ پر

ان کا مطب تھا، سندھ کا قومی مشروب "تھادل" انہی کی ایجاد ہے جس میں سندھ کے موسم، ان کی کیفیات، طبیعت پر اس کے اثرات نیز اہل سندھ کے ذوق اور ان کے مزاج و طبائع کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

پیر ضیاء الدین شاہ بخاری:

گوٹھ پیر جھنڈا کے مشہور راشدی خاندان کے نامور فرزند۔ پیر ضیاء الدین شاہ پانچویں جھنڈے والے (صاحب العلم الخامس) تھے۔ ان کے والد گرامی مرتبت پیر مولانا حاجی ابو تراب رشد اللہ صاحب العلم الرابع وہ بزرگ تھے، جنہوں نے ۱۳۹۱ھ میں مولانا عبید اللہ سندھی کے ایما پر گوٹھ پیر جھنڈا میں دارالرشاد کے نام سے مدرسہ قائم کیا تھا اور حضرت سندھی کو ان کے ذوق کے مطابق خدمات دینی و سیاسی کی پوری آزادی تمام ضروری سرو سامان مہیا کر دیا تھا۔ ان کے بیٹے پیر ضیاء الدین شاہ راشدی صاحب العلم الخامس نے اپنے دور میں مولانا سندھی کو علمی، تعلیمی اور سیاسی کاموں کے لیے، جن میں بیت الحکمت، جمنا زبدا سندھ ساگر پارٹی کے اسکول، تعلیمی مرکز وغیرہ کے لیے اور محمود نگر کے نام سے شیخ الہند مولانا محمود حسن کی یاد میں اہل علم کی ایک بستی آباد کرنے کے لیے ایک بڑا قطعہ زمین عنایت فرمایا تھا۔ احسان اللہ شاہ راشدی جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ حدیث اور رجال کے ایک عدیم النظیر عالم تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی تھے اور پیر وہب اللہ شاہ جوان کے بعد صاحب العلم السادس کی حیثیت میں سجادہ نشین ہوئے آپ کے صاحبزادے تھے۔ اس خاندان عظیم الشان و رفیع الارکان پر "ہمہ خانہ آفتاب است" کی مثال صادق آتی۔ اس خاندان کے اخلاف بھی علم اور خدمت دین، فی سبیل اللہ ایثار، جہاد علمی و لسانی اور تعاون فی البر و الخیرات کی اسی سنت پر قائم ہیں جو ان کے بزرگوں کا خاص امتیاز تھا۔

مولوی شیخ بشیر احمد لدھیانوی :

مولانا احمد علی لاہوری کے شاگرد تھے۔ قرآن حکیم سے خاص شغف تھا۔ حضرت امام سندھی کی وطن واپسی (۱۹۳۹ء) کے بعد وہ مولانا سندھی اور ان کے انقلابی قرآنی افکار سے متاثر ہوئے اور حضرت امام سندھی کے افکار و افادات کی تالیف و تدوین اور اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔ حضرت سندھی کے افادات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ ان میں سے بعض قرآنی سورتوں کی تفسیر میں سات کتابیں نظر سے گزری ہیں۔ ایک کتاب ارتفاقات معاشیہ کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ حضرت سندھی کے امالی کا بیشتر ذخیرہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

کتاب الانقلاب :

مولانا دین محمد وفائی نے سورہ مزمل اور سورہ مدثر کی تفسیر کا نام کتاب الانقلاب لکھا ہے لیکن اس کا صحیح نام "قرآنی دستور انقلاب" ہے۔ میرے سامنے اس کا دوسرا ۱۹۴۶ء کا ایڈیشن ہے۔

ڈاکٹر خان :

کراچی میں حضرت امام سندھی کے معالج

ڈاکٹر احمد سعید :

کراچی میں مولانا سندھی کے معالج جو ازراہ عقیدت خود مولانا کو دیکھنے تشریف لاتے تھے۔

ڈاکٹر ہیمن داس :

کانگریسی رہنما، سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء) میں صحت، صنعت اور شہری دفاع کے وزیر تھے۔ وہ مشہور ڈاکٹر بھی تھے۔ کراچی میں پریکٹس کرتے تھے۔ پورا نام ڈاکٹر ہیمن داس روپ چند واڈوانی تھا۔ روپ چند ان کے والد اور

واڈوانی ان کی برادری یا قبیلہ تھا۔

جی۔ایم۔سید:

(غلام مصطفیٰ شاہ) محمد عثمان ڈیپلائی نے جیتیم بہ معنی "سدا سلامت رہیں" سے خوب صنعت پیدا کی ہے۔ صوفیانہ مزاج کی شخصیت ہیں، کسی کی مخالف نہیں لیکن انہوں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں اور خدمات کا میدان سندھ کو بنایا ہے، وطن کے شیدائی، جدید سندھ کے معمار، سندھی تہذیب کے نمائندہ، سندھی زبان کے محسن، سندھ کی جدید سیاسی تاریخ کے دیدہ ور مورخ، سیاسی سوانح نگار، ان کی تصانیف سندھی زبان وادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں اپنے آبائی گاؤں "سن" تعلقہ کوٹری ضلع دادو (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ تحریک خلافت (۱۹۲۰ء) سے سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت سے لے کر جیئے سندھ تحریک تک کانگریس، لیگ اور دوسری متعدد جماعتوں اور تحریکوں میں حصہ لیا۔ اب وہ اپنی ذات سے خود ایک علمی، تہذیبی اور سیاسی تحریک ہیں۔ سید صاحب کو مولانا سندھی سے بہت عقیدت ہے۔

خان بہادر میر غلام علی تالپور:

وفات ۱۹۶۴ء میر بندہ علی تالپور نامور باپ کے نامور بیٹے تھے۔ ان کا تعلق سندھ کے آخری حکمران میروں کے خاندان سے تھا۔ انقلاب ۱۹۵۷ء کے بعد ایک عرصہ خاموش زندگی گزاری۔ اس صدی کی تیسری دہائی سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد وہ سندھ کی سیاست پر چھا گئے۔ ان کے خاندان کے بیک وقت چار چار افراد سندھ اسمبلی کے رکن ہوتے۔ خاندان کے افراد اپنے سیاسی کیریکٹر کے لیے ہمیشہ نیک نام رہے۔ اس خاندان کے متعدد افراد آج بھی قومی اور وطنی سیاست میں پیش پیش ہیں۔ میر غلام علی تالپور مولانا سندھی سے عقیدت رکھتے تھے۔

عبدالمجید عباسی:

چیف آفیسر حیدر آباد مولانا سندھی کے آخری سفر حیدر آباد تا گوٹھ پیر جھنڈا میں

آپ کے ساتھ تھے۔

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی:

لاڑکانہ (سندھ) کے ایک موضع "رئیس جوگوٹھ" سے آبائی تعلق تھا۔ اب حیدر آباد میں مستقل رہائش ہے۔ علوم اسلامی اور معارف ولی اللہی پر کامل دسترس رکھتے ہیں۔ سندھ کے مختلف مدارس میں تحصیل علم کے بعد دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ فراغت کے بعد سندھ میں شہداد کوٹ، گوردپہوڑ، کراچی کے متعدد عربی دینی مدارس میں مدرس اور صدر مدرس و شیخ الحدیث رہے۔ پھر یہ سندھ ایجوکیشن سروس میں شامل ہو گئے اور عرصہ تک سندھ مسلم کالج کراچی میں اسلامیات کے پروفیسر رہے۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام کے بعد ولی اللہی علوم و معارف کے درس و تدریس اور تالیف و تدوین کے لیے اپنے تئیں وقف کر دیا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اب مولانا اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور ماہنامہ الرحیم (سندھی) اور الولی (اردو) کے ایڈیٹر ہیں۔ مولانا سندھی مرحوم کے وطن واپسی آنے (۱۹۳۹) کے بعد حضرت سے علوم قرآن و حدیث میں تلمذ اختیار کیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک استفادے کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ سندھ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کر چکے ہیں۔ رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین، سندھی ادبی بورڈ کے صدر بھی چند سال تک رہے ہیں۔ مولانا قاسمی کی ذات گرامی منتخبات روزگار میں سے ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے لگ بھگ ہے۔ اس کے باوجود کہ کمزور ہو گئے ہیں لیکن الحمد اللہ ان کا سارا وقت مطالعہ و درس اور تصنیف و تالیف و تدوین کے کاموں میں بسر ہوتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی اور مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی پاکستان کے سرپرست ہیں۔

مولانا عزیز اللہ جروار:

مولانا موصوف سندھ کے ایک بلوچ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شہداد کوٹ ان کا آبائی قصبہ تھا۔ یہ ترک وطن کر کے سکھر کے ضلع میں پنوں عاقل کے قریب، پیر حسن

کے بالمقابل "عزیز آباد" کے نام سے اپنا گاؤں آباد کیا۔ اسی علاقے میں ان کی زمینیں ہیں۔ مولانا سندھی کے آخری دور کے تلامذہ و مستفیضین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ہند پاکستان کے رہنماؤں میں مولانا حسرت موہانی سے ان کی زندگی ملتی جلتی ہے۔ مولانا سندھی کے علوم و افکار کے عاشق ہیں۔ حضرت امام کے آخری دور میں انہیں حضرت کی خدمت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ مولانا سندھی کے تمام عقیدت مندوں سے ان کے ذاتی روابط ہیں اور ان کو نبھانے کے لیے اکثر سیر و گردش میں رہتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی اور مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی پاکستان کے سرگرم رکن ہیں۔

پروفیسر محمد سرور:

(۱۹۰۶ء۔ ۱۹۸۳ء)۔ گجرات (پنجاب) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ میٹرک گجرات سے اور گریجویشن جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی سے کیا۔ جامعہ ازہر (مصر) سے عربی علوم و ادبیات میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ تین سال کے بعد واپسی پر جامعہ ملیہ دہلی میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۸ میں مولانا سندھی نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو کسی پڑھے لکھے مستعد نوجوان کو ان کے پاس بھیج دینے کے لیے لکھا تو قرعہ فال محمد سرور کے نام نکلا۔ سرور صاحب حجاز تشریف لے گئے، مولانا سندھی سے ملے، حج کیا اور مولانا سندھی وطن لوٹے تو وہ بھی واپس آ گئے۔ اس وقت سے لے کر آخر وقت تک انہیں مولانا سے استفادے کے مواقع برابر ملتے رہے اور وہ افکار عبید اللہی کے موتیوں سے اپنا دامن بھرتے رہے۔ اردو زبان میں مولانا سندھی کے وہ سب سے بڑے شارح اور ترجمان ہیں۔ انہوں نے مولانا سندھی کے افکار کو پوری ذمہ داری کے ساتھ تالیف کیا ہے۔ اس میں اسلوب تحریر اور انداز تالیف ان کا اپنا ہے۔ اگر کہیں ان سے مولانا سندھی کے افکار افادات کی تالیف و ترجمانی میں کوتاہی ہوئی ہو تب بھی ان کا کام بہت وقیع اور لائق تحسین ہے۔ انہوں نے مولانا سندھی کے افکار و افادات و تعلیمات اور خطبات و مقالات ترتیب و تدوین میں کئی کام انجام دیے ہیں، شاہ ولی اللہ، جماعت اسلامی، مولانا محمد علی

پر کتابیں مرتب کی ہیں ۔ پنجاب و سرحد کے کئی اخبارات سے تعلق رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ حیدر آباد (سندھ) کے اردو ماہنامہ "الرحیم" کے ایڈیٹر رہے ۔ بعدہ فکر و نظر کراچی و اسلام آباد، المعارف لاہور، الزکوۃ اسلام آباد کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ سرور صاحب بہت با اخلاق، وضع دار، ملنسار اور بامروت انسان تھے۔ مولانا سندھی کے وہ بہت معتقد اور ان کے افکار کی بلندی اور جامعیت کے قائل تھے۔

مولوی عبدالواحد سندھی دہلوی :

(۰۰۰۰ ۔ ۱۹۸۵ء)۔ ان کا وطن مالوف سندھ تھا ۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی چلے گئے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویشن کیا تھا۔ پھر جامعہ ہی سے تعلق پیدا کر لیا تھا بچوں کی صحافت اور ادب سے ان کا خاص تعلق تھا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ حکومت سندھ کے ماہنامہ نئی زندگی کراچی کے ایڈیٹر بنا دیے گئے تھے۔ اگرچہ بچوں کا ادب ان کا خاص میدان تھا، لیکن انہوں نے بڑوں کے لیے بھی علمی تعلیمی، تاریخی موضوعات پر بہت لکھا۔ مولانا سندھی وطن لوٹے اور جامعہ ملیہ دہلی تشریف لے گئے، تو ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ان کی انقلابی شخصیت اور دعوت و عزیمت کے بہت قائل تھے۔ مولانا سے انہیں بہت محبت اور عقیدت تھی۔ بہت با اخلاق اور مرنجان مرنج قسم کے اور محبت کرنے والے اور منکسر المزاج انسان تھے۔

پیر علی محمد راشدی :

(۱۹۰۵ء ۔ ۱۹۸۷ء) ابن پیر حامد شاہ راشدی ۔ ضلع لاڑکانہ کے گوٹھ بہمن میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق سندھ کے مشہور راشدی خاندان کی ایک شاخ سے ہے۔ وہ اردو اور سندھی کے مصنف، کالم نگار اور بلند پایہ صحافی تھے۔ سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور صوبائی اسمبلی کی رکنیت سے وزارت اور سفارت تک مناصب پر فائز رہے۔ وہ

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی فارن کمیٹی کے تحت قائم ہونے والی سب کمیٹی کے سیکرٹری تھے جس نے پاکستان اسکیم تیار کی تھی۔ وہ اولاً قوم پرور مسلمانوں کے نقطہ۔ نظر سے اتفاق رکھتے تھے اور محمد امین خان کھوسو کانگریسی امیدوار کی سندھ اسمبلی کی رکنیت کے انتخاب میں پر زور حمایت کی تھی، پھر لیگی ہو گئے اور ۱۹۳۸ء میں سندھ لیگ کے اجلاس میں تقسیم ملک کی قرار داد اور ۱۹۴۰ء میں پاکستان کی اسکیم کی تیاری کے لیے زبردست جدوجہد کی ۱۹۴۴ء کے بعد انہوں نے دوبارہ کانگریسی نقطہ نظر اختیار کر لیا تھا اور پورے جوش کے ساتھ اس کے لیے کام کیا۔ پیر علی محمد نہایت ذہین، غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کے مالک شخص تھے۔ مولانا سندھی مرحوم کی ذہانت اور ان کے عزائم بلند اور پختہ کریکٹر کے معترف تھے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت "احی جہنمن احی شینھن" میں حضرت امام سندھی کے بارے میں اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اب یہ مفصل بیان اس خود نوشت سے اخذ کرکے "امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی" کے نام سے ایک مستقل کتاب کی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔

داغ دہلوی:

(۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء)۔ مرزا خان داغ دہلوی نام اور نواب شمس الدین خان والی فیروز پور جھرکہ میوات) کے بیٹے تھے۔ اردو شاعری کے نامور اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

جس شعر کا ایک مصرع اس مضمون میں نقل ہوا ہے، وہ مکمل شعر یہ ہے:

تصویر یار اپنی جبیں پر بنائیں گے
بگڑا ہوا ہم اپنا مقدر بنائیں گے

اس غزل کا مطلع یہ ہے:

ہم تیرے کام اے دل مضطر بنائیں گے
اب کے بگڑ گئے تو مکرر بنائیں گے

۲۷ شعروں کی یہ غزل ہے۔ اس کا مقطع یہ ہے:-

ہر وقت داغ کا یہی تکیہ کلام ہے
میرے حضور مجھ کو تونگر بنائیں گے

مولانا احمد علی لاہوری :

(۱۸۸۶ء۔ ۱۹۶۲ء)۔ ابن شیخ حبیب اللہ مولود منشائے طفولیت قصبہ جلال ضلع گوجرانوالہ۔ مولانا سندھی کے دارالرشاد کے زمانے کے شاگرد تھے۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ (دہلی) کے استاد اور مولانا سندھی کی ہجرت کابل کے بعد اس کے ناظم ہوئے۔ وہ ریشمی خطوط سازش کیس کے ماخوذین میں سے تھے۔ دعوت رجوع الی القرآن کے داعی، قرآن حکیم کے مدرس و مترجم، توحید و سنت کے مبلغ، عالم باعمل، مصلح قومی، تقسیم ملک سے قبل جمعیت علمائے ہند کی صوبائی شاخ پنجاب کے صدر تھے، قیام پاکستان کے بعد جمعیت علمائے اسلام (پاکستان) کے صدر اور یکے از ماخوذین تحریک ختم نبوت تھے۔ حضرت امام سندھی سے ایک خاص اور اہم رشتہ یہ تھا کہ مولانا احمد علی کے والد گرامی شیخ حبیب اللہ کے انتقال کے بعد مرحوم کی بیوہ سے مولانا سندھی نے نکاح کر لیا تھا اور مولانا سندھی کی بڑی صاحبزادی مولانا لاہوری کے حبالہ عقد میں آئی تھیں۔

حضرت امام سندھی نے وطن واپسی (۱۹۳۹ء) کے بعد مولانا لاہوری کو قرآن حکیم کے درس و تعلیم میں اپنی نسبت تلمذ کے حوالے سے آزاد کر دیا تھا۔ حضرت سندھی کا خیال تھا کہ انہوں نے رجعت پسند علما سے متاثر ہو کر قرآن حکیم کے انقلابی انداز فکر و تعلیم کو ترک کر دیا ہے۔ حضرت لاہوری نے گزشتہ ربع صدی سے زیادہ عرصہ ایک خاص گردو پیش میں بسر کیا تھا اور ایک خاص ذوق و طبقہ کے علماء میں ایک مخصوص اسلوب درس قرآن اختیار کر لیا تھا۔

قرآن حکیم کے درس و مطالعہ، دعوت و تبلیغ اور انداز فکر و تدبر میں دونوں بزرگوں کے راستے الگ الگ ہو گئے تھے۔ علماء حق نے قرآن حکیم کی خدمات کے اعتراف میں مولانا لاہوری کو شیخ التفسیر کے لقب سے ملقب کیا اور حضرت امام سندھی تفسیر میں اپنے خاص انداز و طرز کی بناء پر ایک خاص دبستان فکر کے بانی قرار پائے۔